(سلسلہ اردو کا [illegible] اللہ دہری مرحوم نمبر ۵)

مشورہ

مشاہیر اُردو کے خیالات کا مجموعہ

مرتبہ

مولوی سید منظر علی صاحب

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں ۱۹۱۶ طبع ہوا

(اور وہیں سے شائع ہوا)

بار اول ۵۰۰ جلد

قیمت بارہ آنہ ۱۲/

سلسلہ یادگار مولانا اشہری صاحب مرحوم نمبر ۵

يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللّٰهِ

مشورہ

اخلاقی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ

مشورہ

محرم کی چاندرات - از مولانا اشہری مرحوم | حسینؑ او خصائل سازی - از حضرت ریاض بنارسی
کلامِ فصیح - از خان بہادر رشاد مدظلہ | رباعیات شہیر - از جناب شہیر مچھلی شہری مدظلہ
معراج شہادت - از خان بہادر مولوی سید خیرات احمد مدظلہ | با دوستان تلطف!

با دشمناں مدارا!!

(مرتبہ مولوی سید منظر علی صاحب)

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

انسٹیٹیوٹ پریس علیگڈھ میں طبع ہوا

بار اول ۵۰۰ جلد | سنہ ۱۹۱۵ء | قیمت ۱۲ /

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشورہ

ایک ایسی قوم جس میں جناب رسالتمآب کی زبان، جناب امیرؑ کا ہاتھ اور حضرت امام حسینؑ کا دل کام کر رہا ہو، لازمی طور پر زمانہ کی رفتار سے سبق حاصل کر سکتی ہے۔ اور ہماری قوم نے بھی زمانہ کو شریک کرنے کی غرض سے انھیں مقدس روحوں کو اپنے لئے آفتاب ہدایت بنایا ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جو قوم اپنے انتہائے مصائب میں بھی علمی اور عملی طور پر ہر زمانہ میں اپنے معاصرین سے پیش رہی ہو اُس کا انتشار اب اس قدر ترقی کر جائے کہ اُسے خود اپنے جمود کی خبر نہ ہو، اُس کے مشاہیر کے ہاتھ اپنی قوم کی صلاح کے لئے کوتاہ ہوں اور اُس کے افراد کو قطع نظر کرکے جب مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حالت بد سے بدتر نظر آئے۔

کوئی قوم اُسوقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اپنی مدد آپ نہ کرے اور کسی قوم کی ترقی کی اُمید اُس وقت تک فضول ہے جبتک کہ اُس کے افراد کو اپنی ترقی کا خود خیال نہو۔ اسی طرح کسی قوم کی قلت اس امر کی مانع نہیں ہو سکتی کہ جو نعمتیں خداوند عالم نے عطا فرمائی ہیں یا جن خوبیوں کو ہادی برحق نے تعلیم فرمایا ہے، اُن کے حاصل کرنے کے بجائے وہ خود کو ایسا ناکارہ کرے کہ دنیا کی کوئی قوم اُس سے زیادہ پست نظر نہ آئے۔ ہم ایک ایسی کشتی پر ضرور سوار ہیں جس کا ناخدا بیدار ہے اور لنگر اپنی جگہہ پر قایم۔ مگر کیا یہ غلط ہے کہ اس کشتی کے تختوں کو ہم خود اپنے ہاتھ سے کاٹ رہے ہیں؟

یہ چند سطریں جنکو ہمارے ناظرین نے اوپر پڑھا ایسے وقت تحریر ہوئی تھیں کہ ہم ۱۴ء کی

دوسری ششماہی اور سال حال کی پہلی سہ ماہی میں اُسوقت کا لحاظ کرکے، گویا اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں کو بسترِ علالت پر کاٹ رہے تھے۔ اور کیسے اُمید تھی کہ ہم اس ناکام خیال کو کہ قوم کی روح کم ازکم سال میں بارہ مرتبہ تازہ کیجاتی رہے، عملی صورت میں دیکھ سکیں گے؟ آپ یہ سمجھئے کہ وہ ایک وقت کا خواب تھا، جس کی تعبیر ناکامی نکلی۔ مگر خدارا ایک منٹ کو بھی یہ نہ خیال فرمائے کہ ہماری اس آواز میں کوئی اثر نہ تھا اور اس صدا پر لبیک کہنے والا تمام مملکتِ ہند میں کوئی نہ نکلا۔ ہماری کروروں کی مردم شماری میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ایسے بیدار دل ضرور نکل آئے جنھوں نے ہماری آواز کا جواب دیا۔ مگر کچھ اسباب تھے جنھوں نے ہمیں اس دریائے محبت میں شناوری کرنے سے باز رکھا یا کوئی قوی سبب ایسا حائل ہوگیا جس کی وجہ سے ہم اپنے خیال کو عملی صورت نہ دیسکے۔

مشورہ کیا ہوتا؟ اس کا جواب دینا بہت بعد از وقت ہے، تاہم آپ اُن چند مضامین سے جنھیں ہم اس مجموعہ میں درج کرتے ہیں اندازہ فرماسکیں گے کہ ہم اور ہمارے ہمقلم حضرات کسطرح اپنی قوم کے مختلف المذاق اور مختلف الخیال لوگوں کے دماغوں پر اثر ڈالنا چاہتے تھے۔ کوئی کلام نہیں کہ یہ رنگ مشورہ میں نہایت گہرا نظر آتا مگر صرف اسی رنگ پر ہمارے خیال کی بنیاد نہ تھی۔ ہم سیاسیات سے قطع نظر کرکے تمام دنیا اور کرہ ارض پر بسنے والی تمام ترقی یافتہ قوموں کے انتہائی سبق کو اپنے ناظرین کے سامنے پیش کرتے۔

ہمارے ایک ہمخیال جو رسالہ کے روح و رواں کا کام دیتے اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں: "مشورہ کا تو نام بھی اب بھول گیا ہوں اور صلاح یہ ہے کہ ہر دماغ اُسے فراموش کردے البتہ قوم کی قسمت پر رو یا مگر اُس کا حاصل"؟

گلیمِ بختِ سیہ را کہ بافتند سیاہ
بہ آبِ زمزم و کوثر سفید نتواں کرد

ہم بھی غالباً ان الفاظ کی تائید کرتے مگر رحمتِ ایزدی سے مایوس نہیں ہیں۔ کیا عجب ہے

کہ ہمارے اس یوسفِ گم گشتہ کی تلاش میں دبوڑھی زلیخا کی جگہ، کوئی جوان دل یعقوب نکل کھڑا ہو، جو ہم سے زیادہ اس کام کا اہل ہو گا۔ فی الحال تو آپ اس خیال پر فاتحہ خیر پڑہیے مگر جن سطروں کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے اُن کو ایک بار پھر دیکھ جائیں کہ قوم کے اندر روح پیدا کرنے کے لئے یہ بھی کافی ہونگی۔

حیدرآباد دکن۔ یکم شوال ۱۳۳۳ھ — سیّد منظر علی

محرم کی چاندرات

(از افاضات مولانا سید امجد علی صاحب اشہری نور اللہ مرقدہ)

حُسن آشنا نگاہ ہو! تمھیں جلوۂ ہوش ربائے ازل کی قسم ذرا عرش لایزال کی طرف دیکھنا کہ پردۂ قدس کی چلمن کیوں بے اختیار اٹھی جاتی ہے۔ عشق آشنا نگاہ ہو! تمھیں طرۂ لیلائے سوادِ شام کی قسم کسی کی پچھلی لن ترانیوں کو بھول کر اونچی نگاہ سے دیکھو کہ گوشۂ افق کے شفقی رنگ میں کس کا خمِ ابرو نظر آرہا ہے۔ تم ابراہیم نہیں کہ ہٰذا ربی پکارتے پھرو۔ موسیٰ جیسے عاشق اور ہوں گے کہ لاکھ ارنی، پر لن ترانی سنا کیے۔ تم اُس قدرت احد کے دیکھنے والے ہو جو ہر وقت تمہارے سامنے ہے، اور اُس عاشقِ معشوق مزاج پیغمبر کے شاگرد ہو جسکو حُسنِ ازل نے خود کھینچا ہے لیکن ہر جا وہ شریعت رکھتا ہے اور ہر دل کو عرفان کی ضرورت ہے۔ اگر آنکھیں ہیں تو دیکھو اور جب وہ ہے تو تمھیں اپنے قریب ہی ملیگا۔ اندھیری رات میں معشوق کو یاد کر کے اور دو چار دفعہ اُٹھ بیٹھکر اُمیدِ وصال پر سو رہنا اور چیز ہے اور روزِ روشن میں اُس کی رضا پر مقتل میں جھومتے چلے آنا اور بات۔

گذرِ منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے — سہل ہے عشقِ بشر، عشقِ خدا مشکل ہے
جنکے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے — وعدہ آساں ہے، وعدے کی وفا مشکل ہے

یہ فقط امر ہوا فاطمہؑ کے جانی سے
مشکلیں جتنی پڑیں کاٹیں سب آسانی سے

یہ وہ مقناطیسی کشش ہے جو معشوق کو عاشق کی طرف کھینچ لاتی ہے، اور یہ وہ دلکش ادا ہے جو

معشوق سے عاشق کے ناز اُٹھواتی ہے۔

صاحبو! کیا دیکھتے ہو، آج محرم کی چاندرات ہے اور ایک حقیقت پناہ کفن بردوش جھومتا چلا آتا ہے۔ وہ دو قدم بڑھتا ہے، جذبِ حقیقی چار قدم کھینچتا ہے۔ یہ دیکھکر وہ دوڑنے لگتا ہے کہ جذبِ مطلوب کو تکلیف نہو۔ حُسنِ ازل بھی اپنا خودآرا جمال اور اپنے طالب کا استقلال دیکھنے اور دکھانے کو آمادہ ہے۔ ارواحِ انبیا کو چھیڑ دیا گیا ہے کہ جناب موسیٰؑ وادی ایمن اور کوہِ طور جیسی لاکھوں چنگاریاں اُڑتی دیکھ لیں۔ جنابِ ایوبؑ اُس کے اور اپنے صبر کا مقابلہ کریں۔ حضرتِ ابراہیمؑ غور کریں کہ اُنھوں نے بفرمان ایزدی کتنی پٹیاں آنکھوں پر باندھ کر ذبحِ فرزند کو ہاتھ بڑھایا اور وہ کس طرح دو لڑکوں کو فی سبیل اللہ نذر کرنے کے لئے حاضر ہے۔ حضرتِ عیسیٰؑ خیال فرمائیں کہ اکیلے صلیب پر چڑھے اور یہاں تمام کنبہ برچھیوں کی نوک پر ہے۔ جناب یعقوبؑ نے گیارہ لڑکے سامنے ہونے پر یوسفؑ کی گم گشتگی سے رو رو کر آنکھیں اندھی کرلیں اور وہ کس استقلال سے تمام کنبے کو راہ خدا میں پیش کر رہا ہے۔ الحاصل وہ اپنے سچے جوش سے تمام ہمراہیوں کو فنافی اللہ کے مقام پر کھینچے لئے جاتا ہے۔

صاحبو! دو دن کی بات اور ہے، دوسرے دن اس مسافر کو وہیں دیکھنا۔ اب ذرا آسمان پر نگاہ کرو اور چاند دیکھو۔ مسلمانو! متواتر دو عیدوں کی خوشیاں منا چکے، اب ذرا دل تھامے ہوئے ہمارے ساتھ چلو۔ ہم کیا کہیں تم خود دیکھ لوگے کہ حُسنِ ازل کے کتنے پردے اُٹھتے اور گرتے ہیں، اور جلوۂ ابد کے کتنے کرشمے مُنہ دکھاتے اور چھپاتے ہیں۔ ہاں! ذرا آنکھ بند کرکے وہ وقت یاد کرو کہ رسول اکرم صلعم کن مصائب سے مکہ چھوڑ کر مدینہ گئے تھے، اور امام حسین علیہ السلام کس آفت سے مدینہ چھوڑنے کا قصد کر رہے ہیں۔ کوفہ وشام کے سیاسی خطوط نے وہ چھیڑ نکالی ہے کہ بے نکلے بن نہیں آتی۔ سفر کا سامان تیار ہو چکا ہے۔ پچھلی رات سے رفقائے مدنی دروازے پر جمع ہیں کہ امامِ عالیمقام کو رخصت کریں، فصحائے عرب بے چین ہیں کہ دودمانِ رسالت کے کوچ پر خطباتِ بلیغ کس سے سنیں گے، اُدبائے حجاز بیتاب ہیں کہ

آفتاب کی تنویر ذرہ میں اور دریا کا نمونہ قطرہ میں دکھانے والا خاندان جاتا ہے۔ بچوں کی نگاہیں عونؑ و محمدؑ پر پڑ رہی ہیں، نوجوان قاسمؑ و علی اکبرؑ کو دیکھ رہے ہیں۔ شجاعانِ عرب تلواریں ٹیک ٹیک کر جناب عباسؑ کو تک رہے ہیں کہ آج اس فخرِ بنی ہاشم کا ساتھ اُن سے چھوٹتا ہے۔ درِ دولت پر یار و انصار کمریں کس کر ہتیار لگا رہے ہیں۔ محمل کسے جاتے ہیں، پردے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ عورات مدینہ رخصت کو چلی آتی ہیں۔ گھر میں کہرام مچا ہے۔ جناب صغراؑ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ علی اصغرؑ کا گہوارہ باہر نکالا گیا ہے۔ حضرت گھر میں جا کر جنابِ صغراؑ کے پاس بیٹھے ہیں کہ نعرۂ حیّ علیٰ خیر العمل نے پھر اٹھا دیا اور سپیدۂ سحر میں نیلی دھاریاں دیکھ کر مسجدِ نبوی کو روانہ ہوئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے وقت میں اس برگزیدۂ امام کا مسجد میں نماز پڑھنے کو جانا اور نانا کے روضہ سے رخصت ہونا کس قیامت کی تصویر پیش کرتا ہوگا! اے رسول کے رتبہ شناسو! دیکھو کہ بعد نماز اُس نے کس طرح اپنے نانا سے فنا فی اللہ کے مقام پر قدم بڑھانے کی اجازت چاہی ہے۔ وہ روضۂ نبوی پر زیارت پڑھ کر سر جھکائے اہل مسجد سے مصافحہ کرتا ہوا باہر نکلا ہے، جس کی یاد سے مدینہ کے در و دیوار ہلتے نظر آتے ہیں۔ آفتاب کی کرن دیکھتے ہی اُس نے حرمِ محترم کے ناقے بڑھوائے ہیں، عزیز و انصار کا پرا اُن کے ساتھ ہے اور سب کے بعد رخصت کرنے والوں کے لئے دعائے خیر کر کے گھوڑے پر سوار ہوا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ قافلہ کہاں جاتا ہے؟ مکہ، کہ خدا کے گھر پہنچ کر پناہ پائے۔ قافلے والے وہاں پہونچ کر احرام باندھ چکے ہیں کہ پرچہ نویسوں نے حجاج کے بھیس میں اشرار کے درپئے قتل و گرفتاری کی خبر دی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں احرام باندھ کر چیونٹی کو نہیں ستاتے مگر فرزندِ رسول صلعم کے لئے یہ تیاریاں ہو رہی ہیں! خانہ کعبہ (جو اُسکے باپ کا مولد ہے) نہیں چاہتا کہ فرزندِ رسول صلعم کے خون سے اُس کے در و دیوار رنگین ہوں۔ الہام یزدانی کہہ رہے ہیں کہ عرفات میں دوڑنے کے لئے یہ لاکھوں آدمی کافی ہیں۔

حُسنِ ازل نے وصل و فصل کے مقامات دکھانے کے لئے حجبِ عرفان اُٹھائے ہیں۔ نورِ عرفان نے 'لی مع اللہ' کے جلوے دکھانے شروع کئے ہیں۔ ایک طرف زمینِ مکہ پکڑے ہے کہ یہاں رہو، دوسری جانب ارضِ کربلا کھینچ رہی ہے کہ اِدھر آؤ۔

محمدؐ ابن حنفیہ نے سمجھایا ہے کہ آپ کوفہ کا قصد نہ فرمائیں، آپ کے لئے یمن جانا بہتر ہوگا مگر آپ نے فسخِ عزم نہیں کیا، اور حرم محترم سے رخصت ہو کر مع اہل و عیال جان بچا کر روانہ ہوئے ہیں۔ راہ میں زرارہ بن صالح نے بھی ایسا ہی عرض کیا ہے لیکن اُس باکشش جوش کا رکنا امکان سے باہر ہو چکا تھا۔ آگے بڑھ کر کوفہ کا ایک مسافر ملا ہے جس نے مسلم دہانی کی نہایت غمناک خبر سُنائی ہے مگر استقلال اجازت نہیں دیتا کہ فسخِ عزم فرمائیں۔ غرض دوسری محرم کو خیامِ امامت ارض کربلا پر نصب ہو گئے ہیں۔ چھٹویں تک عمر ابن سعد خولی، حصین ابن نمیر، شمر ذی الجوشن سنان ابنِ انس، اشعب وغیرہ سرداران کوفہ و شام کی فوجوں نے راستے روک دیئے ہیں، پانی کے گھاٹ بند ہیں۔ اب آگے چل کر گھمسان کی لڑائی ہونے والی ہے جو قیامت تک صفحۂ ہستی پر یادگار رہے گی۔

اشہری! یہ لوگ دنیا میں رہیں گے یادگار
اب نہ پیدا ہوں گے ایسے ساجد و پرہیزگار

ہاں! اب تم شوق سے اس المناک مہینے کا چاند دیکھو مگر یہ یاد رہے۔

بود دہ روز سالے موسمِ ایں دانہ افشانی
بغفلت مگذراں بے گریہ ایامِ محرم را

کلامِ فصیح

(منتخبہ جناب خان بہادر مولوی سید علی محمد صاحب شاد مدظلہ رئیس پٹنہ)

میرزا جعفر علی فصیح جن کی ولادت اودھ کے مَردُم خیز دارالحکومت میں واقع ہوئی تھی، اس شہر کے شرفا سے تھے اور میرزا صاحب کے آبا و اجداد کو لکھنؤ اور دہلی میں معزز فوجی خدمات سپرد تھے۔ اُنکی زندگی کا ایک بڑا حصہ حجاز و عراق کی مطہر سرزمین پر گذرا اور آخری سانس کہ معظمہ کی ارضِ پاک میں نکلی، جہاں وہ اپنی عمر کے چند سال بسر کرچکے تھے۔ گذشتہ زمانہ میں جہاں اور مشاہیر فراموش کردئے گئے تھے میرزا فصیح کے حالات بھی تاریکی میں رہے، مگر ہم حضرتِ شاد مدظلہٗ کے ممنون ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "ذکرِ خیر" میں دلگیر، ضمیر، خلیق، دبیر اور انیس کے بعض اہم سوانح کے ساتھ فصیح کے حالات کو بھی حوالۂ قلم کیا ہی۔ ہمیں اس کتاب کے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور کہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب جلد یا بدیر اہلِ ملک کے ہاتھوں میں پہونچیگی۔

اس کے ساتھ ہی ہم حضرت شاد مدظلہٗ کے الفاظ میں یہ عرض کردینا مناسب موقع خیال کرتے ہیں کہ میرزا فصیح فلسفہ، معرفتِ الٰہی، تصوّف اور تسلیم و رضا کے مضامین سخن گسترانہ بیان فرماتے ہیں، بلکہ اِن مضامین کو پوری طرح باخبر لوگوں کے مانند افراط سے لاتے ہیں۔ اور امام علیہ السلام کے مصائب و شہادت انھیں پر مبنی ہیں۔ ہمارے مرثیہ گویوں کو چاہیے کہ مضامینِ ذیل پر غور کریں اور اپنے کلام میں بیشتر ایسے ہی مضامین داخل فرمائیں جن سے خدا پرستی، معرفت اور تسلیم و رضا کے مسائل کی طرف عام و خاص جھکیں، اور ائمۂ اہلبیت کی شان ظاہر ہو۔

ایک مرثیہ میں حضرت سید الساجدینؑ اور اہلبیتِ اطہار کا قید ہوکر کوفہ میں داخلہ بیان کیا ہے۔ امامؑ غل و زنجیر اور طوق میں جکڑے ہوئے ہیں۔ گلا فگار ہے، پنڈلیوں میں زخم پڑگئے ہیں۔ اور

خون جاری ہے۔ امامؑ کا پانچ برس کا صاحبزادہ (امام محمد باقرؑ) ہمراہ ہے۔ باپ کی مصیبت دیکھی نہیں جاتی۔ کبھی پنڈلیوں کو ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے کبھی طوق کو اُنگلیوں سے سنبھالے رکھتا ہے کہ زخم زیادہ نہ چھلیں کبھی باپ کا مُنہ یاس و حسرت سے تکتا ہے اور بیقرار ہو جاتا ہے کبھی ظالموں کی طرف بلک کر دیکھنے لگتا ہے۔ امام علیہ السلام بیٹے کی بیقراری دیکھ کر یوں تعلیم فرماتے ہیں ؎

کہا رو کے باپ نے اے پسر! تو امام زادہ ہے صبر کر — یہی ذلتیں ہیں شرف ترا۔ نہ ملول ہو نہ ہو چشم تر
اسی زندگی میں تو ہے مزا۔ کہ جو موت سے ہے شدید تر — نہیں سر کٹانے میں برتری۔ نہیں ناگوار وہ اس قدر
ہمیں ہر نفس دمِ تیغ ہے۔ ہمیں ہر قدم پہ جہاد ہے
یہی درد اپنی پسند ہے۔ یہی رنج اپنی مراد ہے

یہ خدا کا فضل ہے صبر کر۔ یہ تعب بھی فوزِ عظیم ہے — نہ تو تو ذلیل و حقیر ہے۔ نہ پدر علیل و سقیم ہے
یہ تفضلاتِ کریم ہے۔ یہ عطائے ربِ رحیم ہے — دلِ داغ دار تو باغ ہے۔ یہ سموم بادِ نسیم ہے
نہ یہ زخم کھانے میں ہے مزا۔ نہ حلاوتیں ہیں یہ حرب میں
کہیں کیا جو ملتی ہیں لذتیں۔ ہمیں تازیانوں کی ضرب میں

یہ جو سر سے تن ہے دہک رہا۔ یہ بدن جو خون سے لال ہے — یہی دل کی عین مراد ہے۔ کہ یہ اپنا جاہ و جلال ہے
ہے جو ضعف و غش کی زیادتی۔ یہی اپنا فضل و کمال ہے — رُخِ زرد و دیدۂ خوں فشاں۔ یہی اپنا حسن و جمال ہے
یہ ہے دستہ سنبلِ تازہ کا۔ سرِ دست میں جو مہار ہے
نہیں سلسلے ہیں یہ بدھیاں۔ یہی طوق پھولوں کا ہار ہے

یہ جو حرفِ تلخ ہیں گوش زد۔ یہ لذیذ تر ہیں نبات سے — یہی تشنگی ہے عزیز تر۔ بخدا کہ آبِ حیات سے
کیا شکر بھوک میں جس گھڑی۔ ہے زیادہ صوم و صلوٰۃ سے — مجھے بحرِ اشک سے فیض ہے نہیں بہرہ آبِ فرات سے
مجھے تلخ گوئیِ شمر میں۔ جو مزا ملا ہے عجیب ہے
شہدا کو کب دمِ تیغ میں۔ یہ مزا یہ ذوق نصیب ہے

بخدا کہ پاؤں کا آبلہ مجھے تاجِ سر سے زیادہ ہے — یہ خلش جو اس میں ہے خار کی۔ مرا دل شگفتہ و شاد ہے

یہ ہوائے تند جو چلتی ہے۔ بخدا کہ بادِ مُراد ہے   اسی قیدِ ظلم میں ہر نفس۔ مرا نفس صرفِ جہاد ہے

میں قدم قدم پہ شہید ہوں۔ میں نفس نفس میں قتیل ہوں
نہ اسیر ہوں نہ مریض ہوں۔ نہ سقیم ہوں نہ علیل ہوں

یہ خدا کا مجھ پہ کرم ہوا۔ کہ جہادِ نفس ہوں کر رہا   یہ بڑا جہاد ہے اے پسر! کہ میں پہلے موت سے مر رہا
نہ جسد رہا نہ نفس رہا۔ نہ نشاں رہا نہ اثر رہا   نہ ہوا رہی نہ ہوس رہی۔ نہ تو دل رہا نہ جگر رہا

نہ فنا رہی نہ بقا رہی۔ جو رہا تو نام قدیر کا!
نہ ہو مضطرب کہ ہے تو خلف۔ بخدا شہید کبیر کا!

بیبیاں اہل کوفہ سے فرماتی ہیں :۔

ہوئیں راہِ حق میں جو ذلتیں۔ ہمیں عزتوں سے زیادہ ہیں   ہمیں قید ہونے کا غم نہیں۔ کہ خوشی سے خرم و شاد ہیں
ہمیں کی ہیں جو جو وصیتیں۔ شہِ بیکساں نے وہ یاد ہیں   ہمیں درد و رنج پسند ہیں۔ جو اسیرِ ابنِ زیاد ہیں

کریں ظالموں کو جو بد دعا۔ تو دوبارہ جوشِ تنور ہو
کوئی حرف شکوہ ادا کریں۔ تو جہاں میں شورِ نشور ہو

تمھیں کیا خبر نہیں کوفیو! کہ نبیؐ کی آل ہیں ہم حزیں   ہیں نبیؐ کی عترتِ طاہرہ۔ ہیں بناتِ سیّدِ مُرسلیں
ہوئے ہم اسیر تو کیا ہوا۔ نہ فقیر ہیں نہ تباہ دیں   ہمیں کپڑے اپنے نہ لا کے دو۔ یہ تصدقات روا نہیں

صدقہ حرام ہے آل پر۔ ہمیں مالِ خمس حلال ہے
ہمیں اس کا لینا روا نہیں۔ یہ طریق اہلِ خیال ہے

غیرت دار بیبیاں اپنے بچوں کی جانب یوں خطاب فرماتی ہیں!

کہا بچوں سے یوں پکار کر۔ نہ یہ میوے کھاؤ اٹھا لو   یہ تُرش ہیں تلخ ہیں خام ہیں۔ انھیں رد کرو انھیں پھینک دو
یہ حرام ہیں یہ زبون ہیں۔ میری جان! ہاتھ میں بھی نہ لو   کرو صبر خلد سے حوریاں۔ چلیں لیکے میووں کے خوان کو

کوئی دم میں فاطمہؑ آئینگی۔ تمھیں پاس اپنے بلائینگی
تمھیں میوے لا کے کھلائینگی۔ تمھیں وادی پانی پلائینگی

نہیں دیر، دیکھو تو تم اُدھر۔ وہ کھلا بہشتِ بریں کا در وہ شجر ہیں میووں کے بارور۔ وہ جنب

وہ لئے ہیں خوانچے حوریاں۔ وہ رسول آتے ہیں تو گر وہ تمہاری دادی ہیں فاطمہؑ۔ وہ خدا

وہ علی نے مشک کو پُر کیا۔ وہ حسنؑ نے جام کو بھر لیا

وہ نبی نے خوانِ طعام کو۔ سرِ حورِ خلد پہ دھر لیا

اہلبیتِ طاہرہ کے سعادتمند بچوں کی حالت حضرت سکینہؑ کی زبان سے

سُنا جب صغیروں نے یہ سخن۔ تو وہ میوے پھینک کے رو دئے یہ سکینہ بولی کہ اے پھوپھی! مِرے دل کو تم

میں تمہارے مُنہ کی بلائیں لوں مجھے معصیت سے بچا لیا مجھے بابِ خلد دکھا دیا۔ وہ کھڑے ہیں

مری دادی میوے وہ لاتی ہیں مرے بابا جان وہ آتے ہیں

مرے دادا خلد میں ہیں کھڑے۔ مجھے پاس اپنے بلاتے ہیں

معراج شہادت

(از جناب خان بہادر مولوی سیّد خیرات احمد صاحب مدظلہ وکیل گیا)

جناب خان بہادر مولوی سید خیرات احمد صاحب رئیس و وکیل گیا (صوبہ بہار) ہماری قوم کے اُن عالی حوصلہ اور قابل قدر و تقلید بزرگوں میں ہیں جنھوں نے کسی وقت خود کو معطل و بیکار نہیں رہنے دیا اور ہمیشہ قومی و مذہبی خدمات کیلئے مشہور و معروف رہے۔ زمانۂ وکالت کے دماغ سوز ایام میں بھی آپ قوم و مذہب کے یادگار خدمات بجا لایا کئے اور جبکہ عمر و علالت نے استراحت و آرام کے لئے اصرار کیا تو آپ نے جمیع اشغال سے کنارہ اور ہر طرف سے بے نیازی حاصل کر کے صرف اپنے دیرینہ و فطری شوقِ خدمات قوم و مذہب سے واسطہ رکھا اور اسی کو اپنا زادِ آخرت بنا لیا! "معراج شہادت" بھی اِن ہی مبارک ایام کا ایک قابل لحاظ اور یادگار مضمون ہے جس نے ہماری موجودہ ضروریات میں سے ایک بڑی ضرورت کو پورا کر دیا۔ ہم دست بدعا ہیں کہ خداوند عالم اس باہمت و عالی نفس بزرگ کو تادیر ہمارے سروں پر قایم رکھے کہ ہمارے دوسری قومی ضروریات اِس ذاتِ والاصفات سے پورے ہوا کریں۔ آمین!!

اس مضمون میں جہاں پر ذکر حضرتِ حرؔ اور شہادت حضرتِ مُسلم و اخبارات کوفہ کا بیان کر کے امام علیہ السلام کے "غم و غصہ" پر بحث اور جن لاجواب دلائل سے اُس کی رد کیگئی ہے وہ نکاتِ لطیف جناب خان بہادر کی بہو (اہلیہ مسٹر سید سلطان احمد۔ ڈپٹی لیگل ریممبرنسر بنگال) کے دماغ و ذہن کا نتیجہ ہے جس سے امتیاز ہو سکے گا کہ ہمارے گھروں میں بھی یہ ذکر کس طرح جاری و ساری رہا کرتا ہے اور اس سے آیندہ کیسے عمدہ و اہم نتایج مترتب ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ باوجود بے پرواہی ہماری عورات کے قوائے دماغی ابتک اتنے ہیں کہ اگر اُنھیں باقاعدہ تعلیم و تربیت دیجائے تو آج بھی

گاؤں گاؤں میں ملکۂ رضیہ اور رابعہ بصری پیدا ہو سکتی ہیں !!

اعتراض ۔ بعض لوگ جناب امام حسین علیہ السلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت نے دیدہ و دانستہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالا اور اس سے نعوذ باللہ حکم خدا

لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃ

کی نافرمانی کی ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آپ بطمع خلافت کوفہ گئے اور وہاں فوجِ مخالفین میں گھر گئے اور نعوذ باللہ اپنی سزائے اعمال کو پہونچے ۔

کیا یہ بات صحیح ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے آپ کو تہلکہ میں ڈالا ؟

جواب ۔ سبحان اللہ ! جناب امام حسین علیہ السلام کی کیا شان پاک ہے کہ دشمن کتنی ہی خاک اُن کے نور پاک پر ڈالیں حضرت کا نور چمکتا ہی جائیگا ۔ آپ اِن اعتراضات کے جواب سُنیئے کہ حضرت نے از ابتدا تا انتہا حکمِ حاکم حقیقی اور رضائے پروردگارِ عالم کا اس قدر خیال فرمایا ہے کہ طاقتِ بشری سے باہر ہے اور اس میں قیل و قال کی کہیں جگہ باقی نہیں ہے ۔

پہلے اعتراض کی نسبت ذرا واقعات پر غور کیجیے ، بکمالِ اختصار عرض کرتا ہوں ۔ جب یزید ماہ رجب ۶۰ھ میں تختِ شام پر بیٹھا تو اُس نے حاکم مدینہ کو لکھا کہ حسینؑ ابن علیؑ سے میری بیعت لو اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو اُن کا سر کاٹ کر بھیجدو ۔ تاریخ سے ثابت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بعد شہادت حضرت علی و حضرت امام حسین علیہم السلام امیر معاویہ تمام ملکِ شام و حجاز اور کوفہ و عراق و موصل کے بادشاہ ہو گئے تھے ۔ تمام میں اُنکا عمل بیٹھ گیا تھا اور ہر جگہ اُن کا سکہ و خطبہ جاری تھا ، اور بعد انتقالِ حضرت امام حسن علیہ السلام دس برس میں اُن کی سلطنت کمال مستحکم ہو گئی تھی اس لیے جب یزید تخت پر بیٹھا تو ساری سلطنت اُس کے ہاتھ آئی سب ملک اُس کا ، لشکر اُس کا ، خزانہ اُس کا اور ہر صوبہ کے گورنر اس کے ۔ ایسی حالت میں کوئی شک نہیں کہ بیعت سے انکار کرنے کی حالت میں حضرت امام حسینؑ کی جان بلکہ سارے کنبہ کی جان معرضِ ہلاکت میں پڑ جاتی ، اس لئے ظاہر ہے کہ اسوقت مدینہ حضرت کے لئے محل خوف ہو گیا تھا ۔

لیکن مکہ معظمہ وہ جگہ ہے جہاں بحکم شریعت پشہ کو ستانے کا حکم نہیں ہے اس خیال سے
حضرت نے پناہ حاصل کرنے کے لئے اپنے اعتقاد کے موافق مدینہ سے مکہ کیطرف ہجرت فرمائی
اس سفر میں فرزندان وعزیزان واہلبیتِ طاہرین علیہم السلام آپ کے ہمراہ تھے۔ ایسی صورت
میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ آپ محل ہلاکت سے محل امن کیطرف گئے، اس لئے یہ الزام
کہ حضرت نے اپنے کو آپ ہلاکت میں ڈالا شروع بسم اللہ ہی کو غلط کر دیتا ہے بلکہ قضیہ برعکس ہو جاتا ہے۔
آپ جب مکہ پہونچے تو حج کا زمانہ آگیا۔ آپ کو خبر ملی کہ فوج یزید شام سے حاجیوں کے بھیس
میں آئی ہے اور اُس کا ارادہ ہے کہ حضرت کو عین حرم پاک میں گرفتار کرے یا قتل کرے۔ یزید کو
جس قدر پاس شریعت تھا ظاہر ہے، اسلئے اس خبر کو باور نہ کرنے کی حضرت کو کوئی وجہ نہ تھی۔
آپ نے خیال فرمایا کہ اگر حرم قدس میں میری ایسی بے حرمتی یا خونریزی ہوگی تو حرم اقدس کا
بڑا استخفاف ہوگا اور (اسلام کی) بڑی توہین ہوگی، بہتر ہے کہ کوفہ چلوں جہاں کے لوگ میرے
لئے تمنائیں کر رہے ہیں۔ یہاں بھی اندک غور سے واضح ہوگا کہ اب مکہ معظمہ حضرت امام حسین ؑ
کے لئے محلِ خوف ہوگیا تھا اور کوفہ محلِ امن سمجھا گیا تھا۔ مگر چونکہ کوفیوں پر آپ کو پورا بھروسہ
نہ تھا اس لئے آپ نے پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم علیہ السلام کو اُس طرف بھیجا اور پھر خود
روانہ ہوئے۔ اس وقت بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت نے اپنے کو ہلاکت میں ڈالا
بلکہ ہر منصف مزاج یہ کہے گا کہ اس موقع پر بھی آپ محل ہلاکت سے محل امن کیطرف گئے۔ بعد
اسکے آپ رفتہ رفتہ نواحِ عراق میں پہنچ گئے، اور حضرتِ حُر علیہ السلام اور اُن کے لشکر سے
(جنکو ابن زیاد گورنر کوفہ نے حضرت کی راہ روکنے کے لئے بھیجا تھا) ملاقات ہوئی۔
حضرتِ حُر کی ملاقات پر آپ کو معلوم ہوا کہ سارا کوفہ آپ کے خلاف ہوگیا اب آپکا معین
ومددگار وہاں کوئی نہیں۔ آپ کے بھائی مسلم علیہ السلام عالمِ غربت میں شہید ہوئے، اُنکے
دو معصوم بچے نہایت بیرحمی سے قتل کئے گئے، شام سے فوج پر فوج آرہی ہے اور ابنِ زیاد کا
حکم ہے کہ حسین ؑ ابن علی جہاں ملیں اُن کو گرفتار کر دو یا قتل کر دو۔ حضرتِ حُر جنکا قلب پاک

نورِ ایمان سے بھرا ہوا تھا، اُسوقت فوجِ مخالف میں تھے؛ مگر لوائے اہلبیت دل میں چٹکیاں لے رہی تھی اس لئے رائے دی کہ اب حضور کا کوفہ جانا مصلحت نہیں ہے اور مدینہ واپس جانیکا حکم نہیں، پس بہتر ہے کہ حضور کسی دوسری جانب تشریف لیجائیں۔ حضرت نے اس رائے کو پسند کیا اور کوفہ سے عنانِ عزیمت موڑ کر شب کے وقت کوچ کیا کہ جدھر اللہ لے چلے اُدھر متوکل بخدا لیے چلے چلو۔

یہاں بھی غور کیجیے کہ حضرت نے حفاظت جان کی بڑی کوشش کی اور محل خوف (یعنی کوفہ) کی طرف رُخ نہ کیا۔ اب گویا نئی راہ اختیار کی تھی۔ آخر تیسری محرم کو زمینِ کربلا پر پہنچ گئے، لیکن ہزار افسوس کہ یہاں ابنِ زیاد کی فوج تعاقب میں آگئی اور آخر افواج کوفہ و شام کی اسقدر کثرت ہوئی کہ حضرت بالکل محاصرہ میں آگئے۔ اب آپ کو کسی طرف جانے کی اجازت یا مہلت نہ تھی۔

اب غور طلب یہ امر ہے کہ ازابتدا تا انتہا حضرت امام حسین علیہ السلام نے جان بچانے کی انتہائی کوشش کی یا نہیں اور جہاں ذرا بھی خوفِ ہلاکت یا خونریزی پایا گیا وہاں سے کوچ کرکے محلِ امن کیطرف روانہ ہوئے یا نہیں؟ پس باوجود ایسی کوششِ بلیغ حفاظت جان کے آپ کو یہ الزام دینا کہ آپ نے اپنے کو ہلاکت میں ڈالا کس قدر لغو اور بے بنیاد ہے۔ حق یہ ہے کہ جناب امام حسین علیہ السلام کی شان عالی انتہائے قیاس سے اعلیٰ ہے یعنی حضرت نے جو کام کیا اُس کو انتہا کرکے دکھادیا۔ جہاں حفاظت جان کی کوشش کی شرعاً ضرورت تھی وہاں ایسی کوشش فرمائی کہ جس سے بڑھکر ممکن نہیں اور جہاں پروردگارِ عالم سے راضی برضا رہنے کا وقت آیا وہاں ایسے صبر و استقلال سے کارروائی کی کہ دنیا کی تاریخ میں اسکا جواب نہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جس صبر و استقلال سے حضرت سید الشہدا علیہ السلام نے عالمِ غربت میں اپنے بھائیوں، بیٹوں، بھتیجوں، بھانجوں کی شہادت گوارا فرماکر خود شربتِ شہادت نوش فرمایا اُسکے مقابل میں کوئی واقعہ کسی مذہب و ملت کا پیش نہیں کیا جاسکتا!

وہ کونسی بات تھی جس نے حضرت سید الشہدا علیہ السلام کو مصائب میں اس قدر مستقل رکھا، اور وہ کونسی عزیز تر شئی آپ کے سامنے جلوۂ ظہور دکھاتی تھی جس کے مقابلہ میں آپ اپنے عزیزوں اور فرزندوں کے تلف ہونے کو دھیان میں نہ لائے ؟

میں لکھ چکا ہوں کہ جب یزید تخت پر بیٹھا تو اُس نے امام حسین علیہ السلام سے بجبر بیعت لینے کا حکم صادر کیا۔ جن الفاظ میں اُسکی بیعت لی جاتی تھی اُن کو شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی رسالۂ تکمیل الایمان میں یوں لکھتے ہیں کہ بیعت کرنے والوں سے اقرار لیا جاتا تھا کہ "یزید چاہے ہم کو مثل غلاموں کے سرِ بازار فروخت کرے یا آزاد رکھے، خدا کی عبادت کا حکم دے یا اُس سے روک دے"۔ اعمال و افعال اُس کے ایسے قبیح تھے کہ جس کی تصریح میں طبیعت کو نفرت اور کراہت ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ شریعت میں جتنے امور حرام ہیں وہ اُس کے حکم سے حلال ہو گئے اور کل احکامِ خدا و رسول طاقِ نسیاں پر رکھ دیئے گئے۔ زنائے محصنہ، لواطہ، شراب خواری، قمار بازی وغیرہ گناہانِ کبیرہ اُس کی شریعت بے عیب "ندارد" میں داخل ہو گئے۔

اب ایسا فاسق فاجر شخص ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امام زماں، فرزند رسول، سید شباب اہل الجنہ سے بیعت کا خواستگار ہے۔ حضرت نے خیال فرمایا کہ ایسے مرتد کی بیعت کرنا منہیات کی رغبت دلانا بلکہ اُسکی حمایت کرنا ہے اور اس میں **اسلام** کا خونِ ناحق ہے یعنی جس اسلام کو آپ کے جد بزرگوار نے سخت مصائب اور کڑیاں جھیل کر قایم فرمایا تھا اُس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اور قوم کو ایامِ جاہلیت سے بھی زیادہ جاہل، شقی، مرتد، بے دین بنانا ہے۔ غرض آپ نے بیعت سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن چونکہ انکار میں خوفِ جان و عزت و آبرو سب کچھ تھا اس لئے حتی الامکان اپنی جان اور اپنے عزیزوں کو اعدائے دین کے شر سے بچاتے رہے اور ایک شہر سے دوسرے شہر لئے پھرے۔ اس کے ساتھ ہی جب اتفاقاتِ زمانہ سے بالکل اعدائے دین کے محاصرے میں آ گئے اور امن و امان کی کوئی جگہہ نہ ملی تو ہر طرح کی صعوبت و شدت اور تکلیف و ایذا گوارا کی لیکن بیعتِ یزید سے ہمیشہ کنارہ و متنفر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب عزیز و اقارب کٹ گئے یہانتک

کہ خاندانِ بنی ہاشم

ایسا اُجڑا کہ پھر نہ آباد ہوا

مگر بیعت یزید نہ کی پر نہ کی۔

میں جملہ مذاہب شیعہ، سنی، ہندو، نصاریٰ، یہود، بدھ، برھمو وغیرہ کے عقلا اور اہل الرائے سے مشورہ طلب ہوں۔ سب غور فرمائیں کہ وہ کونسی شے تھی جس کے مقابلہ میں حضرت سید الشہدا نے اپنے ایسے عزیزوں کے داغ گوارا کئے اور وہ کونسی بات تھی جس کے مقابلہ میں حضرت اپنے خاندان کے تباہ و برباد ہونے کو مطلق دھیان میں نہ لائے؟ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کل مصائب کا ٹال دینا حضرت کے اختیار میں تھا، یعنی اگر آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو پھر کچھ نہ تھا کیا کربلا کی کارروائی حضرت امام حسین علیہ السلام نے بطمع خلافت فرمائی تھی؟

اس کے جواب میں معاندین تو بیشک یہی بول اُٹھیں گے کہ حضرتؑ نے بطمع خلافت یہ کارروائی کی، لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کو طمع خلافت ہوتی تو مدینہ سے سیدھے کوفہ چلے جاتے۔ عرب کا نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ مدینہ سے مکہ چوبیس دن کی راہ پر بجانب جنوب واقع ہے اور کوفہ مدینہ سے بھی بجانب شمال ہے، اس لئے مکہ سے جانب شمال مائل بمشرق ڈیڑھ مہینے کی راہ پر واقع ہے۔ پس بحالت طمع خلافت آپکا چوبیس دن تک بجانب جنوب تشریف لیجانا، بعدہٗ جنوب سے شمال کیجانب پھر لوٹنا اور ایک مہینے کے قریب دہا دے کا سفر کرنا بالکل بیکار معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر لکھنؤ کے کسی شخص کو دارجلنگ میں کوئی مہم پیش ہو تو وہ سیدھا دارجلنگ چلا جائیگا، لکھنؤ سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے دارجلنگ کیوں جانے لگا۔

صاف ظاہر ہے کہ حضرت ایک شہر سے دوسرے شہر کو صرف بنظر حفاظتِ جان اور بخوف بیعت یزید جاتے تھے، اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ اگر بطمع خلافت جاتے تو جیسا کہ میں نے کہا ہی سیدھے مدینہ سے کوفے تشریف لیجاتے، مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کوفہ۔ ۔ ۔ پھیر کھا کر جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور نہ چار مہینے تک مکہ میں قیام کی ضرورت تھی۔ حضرت

امام حسین علیہ السلام نے بتاریخ ۳ر شعبان مدینہ سے ہجرت فرمائی اور بتاریخ ۸ یا ۹ ذی الحجہ مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔

علاوہ اِس کے اس خیال فاسد کا وہیں پر خاتمہ ہو جاتا ہے جب حضرت حُر سے آپ کی ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ سارا کوفہ مخالفت پر کمر باندھے ہے، حضرت مسلم شہید ہو گئے، اُنکے دو معصوم بچے بیدردی سے قتل کئے گئے۔ اس کے بعد آپ کس بھروسے پر طمع خلافت کرتے یا کوفہ کی طرف جاتے ؟ چنانچہ کوفہ نہ گئے، بلکہ متوکل بخدا جہاں خدا لے گیا وہاں گئے۔ آخر جاتے جاتے میدانِ کربلا میں پہونچ گئے اور فوج کثیر کے محاصرہ میں آگئے۔ اس کے بعد جتنی کارروائیاں حضور نے نہایت صبر و استقلال سے کیں اور سخت ترین مصائب برداشت کئے اُن کو تو کوئی عاقل بطمع خلافت کرنے کا گمان تک نہیں کر سکتا، بلکہ اگر آپ کو طمع خلافت ہوتی تو آپ فوراً یزید کی بیعت کر لیتے، کیونکہ اس حالت میں یقین کے ساتھ اُمید کیجا سکتی تھی کہ یزید آپکو کوفہ یا مدینہ کا حاکم مقرر کر دیتا۔ اس طرح آپ مطمئن ہو کر بسہولت جمعیت فراہم کرتے اور حوصلہ کے موافق یزید سے لڑکر خلافت چھین لیتے۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا کی کارروائی ہرگز ہرگز بطمع خلافت نہیں کی تھی

کیا امامِ حسین علیہ السلام ایک ضدّی شخص تھے کہ آپ نے اپنی ضد سے اپنا اور دوسروں کا ضرر کیا ؟ (نعوذ باللہ!)

اندک غور سے یہ اعتراض بھی محض غلط اور تمام تر باطل ٹھہرتا ہے، کیونکہ ضدی، سڑی، سودائی اُس بیوقوف شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی بات کو نہ سُنے اور نہ کسی کا کہنا مانے، نہ اپنی کہے اور نہ اپنے دعوے کی دلیل پیش کرے، بلکہ محض اپنی ضد میں اپنا ضرر کرے اور دوسروں کو ضرر پہنچائے۔ امام حسین علیہ السلام ہرگز ایسے نہ تھے۔ آپ ہر شخص کی بات کو بغور سنتے اور ہر نیک و بد کو میزانِ عقل میں تولتے تھے۔ اگر خود دعویٰ کرتے تو اُس کی معقول دلیل دے کر دوسروں کو قایل کرتے تھے۔

اس کو خوب یاد رکھنا چاہیے فرزندان اور عزیزانِ اہلبیت آپ کے آپ کو نہایت ہی عزیز تھے۔ ہر شخص آپ کی آنکھوں کا تارا اور جگر کا ٹکڑا تھا۔ آپ نے اپنے بچوں کی حفاظت میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور جہاں ذرا جان کا خوف یا فساد کا احتمال ہوا وہاں سے عزیزوں کو ساتھ لے کر فوراً نکل گئے۔ آپ کا مدینہ سے نکل جانا کسی کے خلاف نہ تھا بلکہ ہر شخص حضرت کے اعزا کی جان کی حفاظت اسی میں سمجھتا تھا لیکن جب آپ نے مکہ سے کوفہ کا قصد کیا تو اکثر لوگ مزاحم ہوئے۔ حضرت عبداللہ ابنِ عمر (یعنی حضرت خلیفہ ثانی کے بیٹے) نے کہا کہ مصلحت یہ ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے اور پھر چین سے مدینہ میں قیام کیجئے۔ جناب امام حسین علیہ السلام نے فرمایا "بھائی! یہ کیا کہتے ہو۔ میں ہرگز یزید کی بیعت نہ کرونگا میں اپنے نانا رسول خدا کی سنت اور اپنے باپ حضرت علی مرتضیٰ کی خصلت پر رہونگا" اس فرمانے سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ اگر میں یزید کی بیعت کر لوں تو پھر اسلام کا کہاں ٹھکانا رہیگا!! تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ جس اسلام کو میرے جدِ بزرگوار نے پیٹ پر پتھر باندھ کر پالا پرورش کیا ہے اُس کو میں اپنے ہاتھوں سے کھو دوں، اور جس اسلام کو میرے پدر عالی مقدار نے اپنا سر ہتیلی پر رکھ کر پھیلایا ہے اُس کو میں خود اپنی کارروائی سے ڈبو دوں؟ حضرت عبداللہ ابن عمر مردِ معقول تھے مان گئے۔

اس کے بعد آپ کے سوتیلے بھائی محمد حنفیہ نے منع کیا اور کہا "کوفی بے اعتبار ہوتے ہیں، اُن کے قول و فعل کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ اُدھر آپ تشریف نہ لیجائیے، اُس طرف جانے میں احتمالِ ضرر ہے"۔ آپ نے فرمایا "اگر کوفہ جانے میں احتمالِ ضرر ہے تو یہاں میں کس امن کی جگہ میں ہوں۔ کوفہ کی تو ابھی تک کوئی بات خلاف معلوم نہیں ہوئی ہے، لیکن یہاں تو لوگ حاجیوں کے بھیس میں میرے قتل کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ مکہ معظمہ میدان جنگ اور خانہ کعبہ مقتل ساداتِ بنی فاطمہؑ بن جائے؟ اس سے تو ہزار درجے یہی بہتر ہے کہ متوکل بخدا کوفہ کی طرف جاؤں اور وہاں جو مشیتِ پروردگار ہو اُس پر راضی برضا

رہوں۔ اِس سے اتنا تو ہوگا کہ حرمتِ حرمِ محترم (خانۂ کعبہ) برباد نہوگی۔" محمدؐ حنفیہ اس کو ماننے کہنے لگے "اچھا! آپ خود تشریف لیجایئے، لیکن حرمِ محترم کو ساتھ نہ لیجایئے۔" چونکہ حضرت محمد حنفیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بھائی تھے اس لئے آپ کو مجبوری ہوئی کہ اپنے دردمند بھائی کو ایک سرِخفی سے بھی آگاہ کر دیں، اس لئے حضرت نے فرمایا "اس میں مَیں مجبور ہوں ناناؐ کا حکم یہی ہے"۔

یہ تو سرِخفی تھا، لیکن میں کہتا ہوں کہ باسبابِ ظاہر بھی کوئی عاقل اس سے اختلاف نکریگا کہ جب مدینہ اور مکہ دونوں آپ کے لئے محلِ خوف ہوگئے تھے تو حضرت کا مع اہلبیتِ طاہرینؑ کے کوفہ کیطرف تشریف لیجانا خلافِ مصلحت نہ تھا۔ اگر تنہا جاتے تو عیال و اطفال کو کس پر اور کس اُمید پر چھوڑ جاتے ہ جتنے فرزند و عزیزان حضور کے تھے، سب آپ کو بہت پیارے تھے۔ آپ اُن کو اس محلِ خوف میں چھوڑ نہ سکتے تھے اور وہ لوگ حضور کو تنہا کہیں جانے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ سب کے سب ساتھ ہوئے۔ صرف حضرت عبداللہ (شوہر حضرت زینب) اور حضرت محمدؐ ابنِ حنفیہ بوجہ علالت کے ساتھ نہو سکے۔ ان کے سوا تو سارا کنبہ آپکے ہمراہ تھا۔ اور آیندہ جو کچھ ہوا اس وقت تو ایک بہادر فوج بھی آپ کے ہمرکاب تھی۔ ایسی حالت میں اس قافلہ کو چھوڑ کر اہل و عیال کو دو علیل بھائیوں کی حفاظت میں چھوڑنا اور خود مدینہ سے ہجرت فرمانا ہرگز مصلحتِ وقت کے موافق نہ تھا۔ یہ دیکھکر محمدؐ ابن حنفیہ بھی راضی ہوگئے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جب حضرتِ حُرؑ نے ردّ و بدل کے بعد شب کے وقت تخلیہ کی ملاقات کی تو امام علیہ السلام سے کہا کہ "یا حضرت! اس وقت میرا سارا لشکر سوتا ہے آپ اسی وقت کوچ کرجایئے تاکہ اعدا کے شر سے نجات ملے۔" آپ نے فوراً اس رائے کو قبول کرلیا اُسی وقت حضرت عباسؑ کو کوچ کا حکم دیا اور خیمہ اُکھڑ گیا۔ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام ایک معمولی جوشیلی طبیعت کے عرب ہوتے تو بمجرد سماعت اس خبر کے کہ کوفیوں نے عالمِ غربت میں آپکے بھائی حضرت مسلمؑ اور اُن کے معصوم بچوں کو نہایت بیرحمی سے شہید کیا، بنظرِ انتقام کوفہ چلے جاتے

اور اپنے مظلوم بھائی اور بھانجوں کے خون کا بدلہ لیتے۔ لیکن چونکہ آپ نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھے، آپ نے ان واقعات پر صبر کیا اور کوفہ کی طرف کا قصد نہ کیا۔

اس وقت آپکا اپنے غم و غصہ کو ضبط کرنا بیان سے زیادہ قابل خیال ہے۔ حضرت مسلمؑ آپ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے اور آپ کی سوتیلی بہن یعنی حضرت عباسؑ کی حقیقی بہن سے بیاہے ہوئے تھے۔ حضرت کی یہ بہن یعنی زوجہ حضرت مسلمؑ بھی اس سفر میں آپ کے ہمراہ ہیں، حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی مصیبت زدہ بیوہ بہن کی آہ وزاری کو سُن رہے ہیں۔ یہ بھی خوب سمجھ رہے ہیں کہ اس غریب بیوہ بہن کے شوہر کو ہم نے خود کوفہ کی طرف بھیجا تھا، تاہم نہایت ضبط اور تحمل سے کام لیتے ہیں۔

یہ واقعہ ایسا ہے کہ ہم سے سرد مزاج ضعیف القلب آدمی کی رگِ ہاشمی کو بھی جوش میں لا سکتا ہے۔ ہم لوگ تو اپنے آپے میں نہ رہتے اور یہ کہہ اُٹھتے کہ ہرچہ بادا باد، ظالموں کو ضرور سزائے اعمال دینی چاہیئے۔ مگر فرزند رسولؐ کے ضبط و تحمل اور دور اندیشی کے قربان کہ اپنے غیظ و غضب کو ضبط کیئے ہوئے ہیں، اور کس فہم و فراست اور دور اندیشی سے غور فرماتے ہیں کہ اگر میں اس جماعتِ قلیل کے ساتھ ایک جابر بادشاہ کے ظالم گورنر کے دارالحکومت پر حملہ کروں تو نتیجہ اسکے سوا کچھ اور نہو گا کہ ایک بھائی دو بھانجے تو قتل ہو چکے بقیہ بھائی، بھتیجے، بھانجے سب کٹ جائیں لیکن نہ خدا خوش ہو نہ رسول خوش ہوں۔ ایسی حالت میں مجھے اپنی نفسانیت اور اپنے غیظ و غضب کی تشفی کے لئے ہرگز ہرگز روا نہیں کہ ایسے ایسے نادر و نایاب جواہر (اعزہ) کو اپنے ہاتھوں سے گنوا دوں، بلکہ مناسب وقت یہی ہے کہ اسوقت کوچ کر جاؤں تاکہ میرے عزیزوں کی جان بچے۔

اگر آپ غور فرمائیں گے تو اسی ایک واقعہ سے یہ دونوں اعتراض یعنی (۱) یہ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے کو تہلکہ میں ڈالا، اور (۲) یہ کہ حضرت ایک ضدی شخص تھے۔ ۔ ۔ ۔ ایکدم پاش پاش اور ہوا ہو جاتے ہیں۔ کون شخص بحالتِ صحت ذات و ثبات و عقل ایسے متحمل، بردبار، ضابط اور کاظم الغیظ شخص کو ضدی اور اپنے کو آپ ہلاکت میں ڈالنے والا کہہ سکتا ہے؟ اور

اس کے بعد تو کوئی مسلوب الحواس بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کربلا میں نہایت صبر و استقلال سے حضرت امام حسین علیہ السلام نے جو کارروائیاں کی تھیں وہ بطمع خلافت کی تھیں۔

آخر آخر وقت تک معرکۂ کربلا میں آپ نے عمر ابن سعد سے بار بار کہا اور متواتر خطبات ارشاد فرمائے کہ "اگر تم لوگ ہماری جان (اور ہمارے عزیزوں کی جان) کی اماں دو تو ہم تمہارا ملک چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہ ہم مکہ جائیں گے نہ مدینہ اور نہ کوفہ ہم یمن یا دیارِ ہند کی طرف چلے جائیں گے تاکہ تم کو میری طرف سے کسی قسم کے ضرر کا گمان نہ ہو۔"

اب آپ فرمائیے کہ اس سے زیادہ جناب امام حسین علیہ السلام اور کیا کہتے یا کیا کرتے، یا کوئی دوسرا عاقل و فرزانہ شخص کیا کرتا؟ پس ایسے سخن شنو، مصلحت بیں، صلح جو، اماں طلب شخص کو ضدی اور ہٹ دھرم وہی شخص کہے گا جو خود سڑی سودائی ہوگا۔

کیا حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا کا معرکۂ عظیم صرف اعزازِ خاندانی یا بقائے اسلام کے خیال سے اختیار فرمایا تھا؟

اگر حضرت کو طمع خلافت نہ تھی یا ضدی شخص نہ تھے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی بات آپ کے دل میں ایسی تحریک پیدا کرتی تھی جس کے مقابلہ میں آپ نے بیعتِ یزید کا ننگ گوارا نہ کیا؟ اس کے جواب میں بعض اہل الرائے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت نے عزتِ خاندانی کے خیال سے ایسا نہ کیا، لیکن جہاں تک میں دیکھتا ہوں ساتویں محرم کو یہ بات بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ساتویں محرم وہ تاریخ ہے کہ تیس ہزار سے زیادہ لشکرِ جرار آپ کے مقابلہ کو پہنچ گیا۔ آپ چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں، گھاٹ رک گئے، پانی خیموں میں آنا بند ہو گیا، العطش العطش کی ہر طرف پکار ہونے لگی۔ چاروں طرف نیزوں کی بھالیں چمک رہی ہیں، تابشِ آفتاب سے خیمے دہک رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ صلح کر لیتے تو سابق کی خاندانی نظیروں کے خلاف نہ ہوتا؛ کیونکہ اس سے بہت کم حالت تھی جب خود حضرت سرورِ کائنات نے بمقام حدیبیہ کفارِ قریش سے صلح فرمائی تھی، اس سے کم حالت تھی جب حضرت کے والد بزرگوار

حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام جنگ صفین میں امیر معاویہ سے صلح پر مجبور کیے گئے تھے، اس سے بہت کم حالت تھی جب آپ کے برادر عالیمقدار حضرت امام حسن علیہ السلام امیر معاویہ سے صلح پر مجبور ہوئے تھے۔ اس لئے اگر آپ بھی صلح کر لیتے تو اعزازِ خاندانی کے خلاف نہ ہوتا پس یہ بات کہ حضرت نے مجرد اعزاز خاندانی کے خیال سے اتنا بڑا معرکہ گوارا فرمایا اور اس صبر و استقلال سے اپنا گھر لٹا دیا دلنشین نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں دل کو تشویش ہوتی ہے کہ واقعی کیا بات حضرت امام حسین علیہ السلام کے خاطرِ مبارک میں تحریک کرتی تھی کہ آپ نے سب صعوبتیں گوارا فرمائیں لیکن یزید کی بیعت نہ کی؟ اس کے جواب میں اہل الرائے کہہ سکتے ہیں کہ قیام و استحکامِ اسلام کے لئے حضرت نے یہ سب صعوبتیں گوارا فرمائیں۔ مجھے اس رائے کے صائب ہونے میں مطلق کلام نہیں۔ لیکن میں جہاں تک خیال کرتا ہوں نویں محرم کی شام سے جو کارروائی حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمائی اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بقائے اسلام کے علاوہ حضرت نے اپنی ذاتی ترقی اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہونے کا اہتمام آغاز فرمایا تھا۔ یہ اس طرح پر کہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے :-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝

خلاصہ یہ ہے کہ ہم تمہارا اِن پانچ چیزوں میں سے کسی ایک چیز یعنی خوف، بھوک، نقصانِ مال، نقصانِ جان، یا نقصان ثمرات یعنی اولاد میں امتحان کرینگے۔

قربانِ ہمت فرزندِ رسولؐ کہ آپنے فرمایا: خدایا لبیک۔ تیرا یہ بندۂ احقر پانچوں امور میں بلکہ اُن سے زیادہ امور میں بیک وقت امتحان دینے کو حاضر ہے۔ حکم الٰہی آیا بسم اللہ! میدان میں آیئے۔ ہمارے فرشتے آپ کے صبر و استقلال کا موازنہ کریں گے۔

حقتعالیٰ نے اُسی آیہ کریمہ میں فرمایا ہے کہ جو میرے خاص بندے صابر ہیں وہ مصیبت پڑنے کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں، یعنی کہتے ہیں کہ خدایا ہم تیرے لئے ہیں اور تیری طرف بازگشت کرنے والے ہیں۔ اس امامِ جلیل خلاصہ خاندان ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے خیال کیا کہ فقط زبانی انا للہ وانا الیہ راجعون کہا تو کیا، اگر اپنے افعال سے دکھادوں کہ واقعی ہم لوگ تیرے لئے (خدا کے لئے) ہیں اور تیری طرف بازگشت کرنے والے ہیں تو البتہ سند ہے!۔

نویں محرم کو جب ابنِ سعد نے لڑائی چاہی تو حضرت نے اس اہتمام کے لئے ایک شب کی مہلت لی جب یہ مہلت منظور ہوئی تو شام کے وقت آپ نے اپنے تمام انصار کو ایک جگہ جمع کرکے فرمایا کہ یہ فوجِ کوفہ و شام ہمارے سر کی طلبگار ہے تم سے اس کو کوئی مخاصمہ نہیں، اور جس حالت میں میں پہنچ گیا ہوں اب اُس سے میری جانبری محال ہے۔ پس تم میرے لئے کیوں اپنی جانیں تلف کرتے ہو۔ میں تم کو بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ تمہارا جدھر جی چاہے چلے جاؤ، بلکہ میں اپنی بعیت بھی تم سے اُٹھائے لیتا ہوں۔

یہ امر کچھ کم غور طلب نہیں کہ اگر مقصدِ اقصیٰ آپ کا صرف بقائے اسلام ہوتا تو اپنی جماعت کو کم نہ کرتے؛ کیونکہ آپ کی فوج جس قدر زیادہ ہوتی اُسی قدر قوتِ ظاہری بھی زیادہ ہوتی۔ چنانچہ یہ عام قاعدہ ابتک چلا آتا ہے کہ حالتِ خوف میں سردار لشکر جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنی جماعت کو سمیٹے رہتا ہے، بلکہ بھاگنے والوں کو گولی مارنے کا حکم دیتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کارروائی سے حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقصد اقصیٰ یہ تھا کہ اے حسینؑ! امتحان تو شروع ہوگیا، بھوک پیاس کی شدت شروع ہوگئی، اب انا للہ وانا الیہ راجعون کی عملی تیاری کرو۔ اس لئے پہلے آپ نے اُن لوگوں انتخاب کیا جو زمرۂ انا للہ میں داخل ہونے کا شرف پانے والے تھے۔ بہتر بزرگوار ایسے نکلے جنھوں نے بخشوع وخضوع اس مقدس فہرست میں اپنے نامِ نامی لکھوائے، لیکن جنکی قسمت میں یہ شرف نہ تھا وہ لوگ

شبِ عاشورہ اِدھر اُدھر چل نکلے۔

الغرض شب بھر حضور اقدس نے عبادتِ خدا میں بسر کی، نمازیان باصفا، رضای پروردگارِ عالم کے حصول کے لئے بیچین رہے، اہلبیت طاہرین نے اپنے اپنے فرزندوں کو سنوارا اور تلقین کی کہ دیکھو کل تمہارے آقا پر حملہ ہوگا ایسا نہو کہ پسپا ہو جاؤ یا شمشیرِ مخالفین سے ڈر جاؤ یا بھوک پیاس کی شدت سے تڑپنے لگو۔ اُن معصوموں نے یقین دلایا کہ اگر ہم اپنے آقا پر اپنی جانیں فدا نہ کریں تو آپ دودھ نہ بخشیں!

شبِ عاشور کٹ گئی اور صبح شہادت آئی! اب غازیانِ دین، سفرِ آخرت کی تیاری کرنے لگے۔ ادھر آقا سے اجازت ملی فوراً گھوڑے اُڑاتے ہوئے شاداں و فرحاں میدانِ جنگ میں گئے اور کمالِ بہادری اور جانثاری دکھا کر رحمتِ خدا سے جا ملے آخر عزیزوں کی نوبت پہونچی اور

وہ بچھڑنے لگے گودی میں جنھیں پالا تھا!

دو بقیہ پسرانِ مسلم بھی شہید ہوئے، حضرت امام حسین علیہ السلام راضی برضا رہے۔ پیاری بہن زینبؑ اپنے بیٹوں کو رخصت دلوانے کے لئے حاضر ہوتی ہیں۔ قلب پر سخت چوٹ پڑتی ہے، بہن کی کمائی ہاتھ سے کھوئی نہیں جاتی مگر نہایت استقلال سے پیارے بھانجے میدان میں بھیجے جاتے ہیں اور جب اُنکی لاشیں آتی ہیں تو صدمہ تو انتہا کا ہوتا ہے مگر جادۂ صبر و استقلال سے قدم نہیں ہٹتا۔

اب اس مصیبت کا سامنا ہے کہ تازہ داماد رخصت پر مصر ہے، برادرِ مرحوم کی نشانی ہاتھوں سے جا رہی ہے، بیٹی کے رنڈسالہ کا سامان ہو رہا ہے مگر پھر رخصت سے انکار نہیں کیا جاتا۔ خود اپنے ناشاد نامراد داماد کو گھوڑے پر چڑھاتے ہیں اور جب اُس کی لاش آتی ہے تو باوجود خیمۂ مبارک میں کہرام پڑنے کے حضرتؑ کا استقلال نہیں جاتا، اور بالکل راضی برضا رہتے ہیں۔

اب وہ وقت آیا کہ برابر کا بھائی جو اشجع الناس تھا اور جس سے ہر شخص کو بڑی تقویت تھی

رخصت طلب ہیں آپ کی آنکھوں میں دنیا سیاہ معلوم ہوتی ہے، مایوسی چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے لیکن اپنے قوتِ بازو کو اجازتِ جنگ دیتے ہیں، اور جب وہ جاں نثار بھائی آواز دیتا ہے "یا اخی یا مولائی ادرکنی" تو آپ کو صدمہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کمر خمیدہ ہو جاتی ہے طاقت رفتار جاتی رہتی ہے اور عالمِ یاس میں بےچین ہو کر فرماتے ہیں الآنَ انکسرتْ ظھری وقلّت حیلتی، یعنی اب میری کمر شکستہ ہو گئی اور ساری آس ٹوٹ گئی۔ لیکن اس پر بھی جب اُس قوتِ بازو بھاوُ بھائی کی لاشِ مبارک پر پہونچتے ہیں تو کمالِ صبر و استقلال کے ساتھ خالی مشک و علم کو لیکر خیمۂ مبارک میں واپس آتے ہیں اور آزادی میں ویسے ہی مستقل رہتے ہیں۔

اس کے بعد اس فخرِ خاندانِ خلیلؑ و اسمٰعیلؑ کے سامنے یہ مرحلہ پیش آیا کہ اٹھارہ برس کا نوجوان بیٹا ہمشکل رسولؐ جس کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد آتے تھے رخصت طلب ہے اور اسی میدان میں جانا چاہتا ہے جہاں ابھی تک حضرت عباس غازی کی لاش پڑی ہوئی ہے، اُس وقت حضرت امام حسینؑ کے دل پر چوٹ تو ایسی پڑتی ہے کہ بیقرار ہو کر گر پڑتے ہیں لیکن ایک ایسی چیز (القا رحمتِ پروردگارِ عالم) اپنا جلوۂ ظہور دکھاتی ہے کہ اس کے پرتو سے آپ حضرت علی اکبر کی مرگِ شباب کو دھیان میں نہیں لاتے، حالانکہ صدمۂ قلبی آپ کو ویسا ہی ہو رہا ہے۔ منقول ہے کہ قبلِ شہادتِ حضرت علی اکبرؑ آپ کی ریشِ مبارک کے کل بال سیاہ تھے مگر بعد شہادت فرزند زیادہ تر بال سفید ہو گئے۔ اس پر بھی آپ کے صبر و استقلال میں فرق نہ آیا اور اپنے لختِ جگر کے سینۂ مبارک سے خود برچھی کا پھل نکالا اور راضی برضا رہے۔ امتحان دینا اسے کہتے ہیں!!!

اتنے میں فضہ نے آواز دی "یا حضرت علی اصغر پیاس کے مارے دم توڑ رہا ہے خبر لیجئے" آپ اس بچہ کو میدان میں لائے اور فرمایا کہ "میرا بچہ ناقہ صالح سے کم نہیں ہے۔ ہے کوئی ایسا جو اس معصوم بچے کے حلقِ خشک تک تھوڑا پانی پہونچائے؟" اس کے جواب میں بےرحم حرملہ نے اُس بچہ کو آپ تیر سے سیراب کیا اور وہ بچہ تڑپ تڑپ کر آپ کی گود میں شہید ہوا۔

اب حضرت یکہ و تنہا رہ گئے، اور خود لقائے پروردگار عالم اور جوارِ رحمت سے ملنے کے لئے تیار ہوئے۔ عصر کا وقت آگیا ہے، زخموں سے چور چور ہو کر گھوڑے پر ڈگمگاتے ہیں جسم پر اُنیس سو سے زیادہ زخم پڑ چکے ہیں، تیر بدن میں پیوست ہیں لیکن استقلال وہی ہے۔ بلکہ غالباً اس خیال سے کہ "اے حسینؑ اپنے حبیب کے پاس جاتے ہو تو تمام امتحان پورے کرلو۔ ذرا چلتے چلتے اپنی پیاری بہنوں اور بیٹیوں کو تو دیکھ لو، ایسا نہ ہو کہ کہا جائے کہ اگر اُنکی مایوسانہ صورتیں تمہارے سامنے ہوتیں تو تمہارے دل پر ایسا اثر پڑتا کہ تمہارے استقلال میں فرق آجاتا۔" آپ فوراً درِ خیمہ پر تشریف لائے۔ اُس وقت حضور کے جسم مبارک میں اس قدر تیر پیوست تھے کہ اہلبیت علیہم السلام کو شناخت میں تامل ہوا۔ جب سبھوں نے پہچانا تو سب بیبیاں آکر قدم پاک سے لپٹ گئیں اور آپ کی دُختر چار سالہ حضرت سکینہؑ سینہ سے چمٹ گئی حضرت نے اپنے فرزند علیل کو جگایا اور بعد ودیعتِ اسرار امامت و احکامِ شریعت رخصت طلب ہوئے۔ خیمہ مبارک میں کہرام پڑ گیا۔ اُس وقت کا عالم بیان سے زیادہ قابل خیال ہے آپ نے پہلے حضرت سکینہؑ کو گودی سے اُتار کر حضرت زینبؑ کے حوالہ کیا اور کہا "بہن! میری یہ بیٹی بہت ناز پروردہ ہے، اسکی برابر خبر لیتی رہنا"، بعدہٗ بہت منت کر کے سب بیبیوں سے رخصت ہوئے اور خیمہ مبارک سے باہر آکر بزبانِ حال یہ فرمایا ؎

یارب! ہے یہ سادات کا گھر تیرے حوالے　　رانڈیں ہیں کئی خستہ جگر تیرے حوالے
بیکس کا ہے بیمار پسر تیرے حوالے　　سب ہیں ترے دریا کے گہر تیرے حوالے
عالم ہے کہ غربت میں گرفتارِ بلا ہوں
میں تیری حمایت میں انھیں چھوڑ چلا ہوں

اب میں ہفت اقلیم کے اہل الرائے سے سوال کرتا ہوں، خوب غور کر کے فرمائیں کہ اس وقت جناب امام حسینؑ کے دل میں کونسی بات تحریک کرتی تھی کہ اپنے ناموس کو یوں بے سہارے چھوڑ کر میدان کی طرف جاتے ہیں اور جس وقت حضورِ اقدس نے حضرت سکینہ کو اپنے آغوش مبارک

سے اُتارا اُس وقت کونسی عزیز ترشے آپکی آنکھوں کے سامنے تھی جس نے حضرت سکینہ کی صورت پر پردہ دے دیا؟ فقیر کے نزدیک اس کے سوا اور کوئی بات معلوم نہیں ہوتی کہ اب حضور کو درجۂ وصال ملنے والا ہے اور لقاءِ رحمت اپنا جلوۂ ظہور دکھا رہی ہے۔ اسی وجہ سے اہل حرم کی بیکسی اور بیچارگی رجوعِ قلب میں فرق نہیں آنے دیتی۔

اس درجۂ وصال پر فائز ہونے کے لئے یہ زینہ بڑا دشوار گذار تھا لیکن قربان ہمتِ فرزند رسولؐ کہ آپ اس زینہ سے بھی بآسانی بڑھ گئے اور اہلِ بیت طاہرینؑ کو سپردِ خدا کر کے میدان میں تشریف لائے۔ اب تو صرف آخرکار ایک زینہ باقی ہے، یعنی حضرت گھوڑے سے گرے، شمر خنجر بکف آکر سینہ مبارک پر سوار ہوا اور حضرت اس وقت اُمتِ عاصی کے حق میں دعا کرتے ہوئے عرش اعظم پر پہونچ گئے۔ اور درجۂ وصال سے مشرف ہو کر رحمتِ ایزدی سے مل گئے اور اپنے بے بہا صبر و استقلال سے "انا للہ وانا الیہ راجعون" کے حقیقی معنی پر فائز ہو کر زندۂ جاوید ہو گئے!

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

ایسے ہی بزرگوں کی شانِ پاک میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

یعنی

جو لوگ راہِ خدا میں قتل ہوئے ہیں اُن کو مُردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اُن کے دیکھنے کا شعور نہیں۔

اگر اس آیہ کریمہ کے مدارج کے قابل شہدائے کربلا نہ سمجھے جائیں تو دنیا کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجئے کوئی دوسرا شخص اس کا مستحق نہ ملیگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب سید الشہداء علیہ السلام کی ذاتِ بابرکات ایسی ہے کہ قطع نظر اس امر کے کہ آپ رسولؐ برحق کے نواسے ہیں اور قطع نظر اس کے کہ آپ امام ابن امام

ہیں خود آپ کی سیرت اور آپ کے اعمال ایسے ہیں کہ ہر شخص آپ کو انسان کامل سمجھے گا کیونکہ جو شخص واقعاتِ کربلا کو بنظرِ غور و تعمق دیکھے گا وہ عام اس سے کہ اُس کا اپنا کچھ ہی مذہب کیوں نہو بلا ریب و شک کہے گا کہ حسین ابن علی علیہم السلام نے ایسے ایسے سخت اور جاں گزا مصائب صرف اس وجہ سے اختیار کیے تھے کہ اُن کو اس کا کامل یقین ہوگیا تھا کہ جو بات میں نے دل میں ٹھان لی ہے اُسی میں پروردگار عالم کی خوشی ہے؛ یعنی اگر میں یزید کی بیعت کروں تو اسلام بالکل تباہ و برباد ہوجائے گا اور اب وجد کا سارا ریاض مٹی میں مل جائے گا۔ لیکن اگر میں یزید کی بیعت نہ کروں تو اسلام قایم رہے گا اور خداوندعالم مجھ سے راضی اور خوشنود ہوگا، اور خوشنودی و رضائے پروردگارِ عالم کے لئے سب مصیبتوں اور آفتوں کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کرنا کمالِ عبودیت ہے، اس لئے اس فی سبیل اللہ مہم میں کسی چیز کو حتیٰ کہ اپنے فرزندوں اور جگر گوشوں کو بھی جو میرے سرمایۂ زندگی ہیں عزیز کرنا نہ چاہیئے۔ کوئی شک نہیں کہ حضرت نے تمام مصائب ہر قسم کی تباہی اور خانہ بربادی صرف رضائے الٰہی کے لئے گوارا فرمائی۔ پس جو شخص مجرد حق تعالیٰ جل شانہٗ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اپنے بیٹے بھتیجے بھانجے بھائی کی شہادت قبول فرماکر خود عالم غربت میں بھوکا پیاسا شہید ہو اُس کے مقبولِ بارگاہ احدیت ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے؟

ہاں یا اگر کوئی مخالف کہہ سکتا ہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت اپنے خیال ہی میں غلطی پر تھے۔ لیکن اس کی نسبت بھی غالباً کوئی شخص انکار نہ کریگا کہ یزید کے اعمال و افعال بالکل اسلام بلکہ تہذیب و اخلاق کے ڈبونے والے تھے۔ اس لئے اُس کی بیعت کرنے سے اسلام خاک میں مل جاتا اور انسان بہائم ہوجاتے! تب یہ خیال ہرگز غلط نہیں ہوسکتا کہ حق تعالیٰ محرب دین اسلام اور محربِ تہذیب و اخلاق کی حمایت کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ حضرت سید الشہدا کا یہ علم و یقین کہ خداوندعالم کی خوشی اسی میں ہے کہ میں یزید کی بیعت نہ کروں اور اسلام کو بے داغ اور بے عیب رکھوں غلط نہ تھا۔ کوئی شک نہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے رضائے پروردگارِ عالم

کے لئے وہ کام کیا جو آج تک کسی بشر سے نہو سکا، پس آپ بلاریب وشک دنیا کے ایک بڑے فرد فرید اور سید الشہدا ہیں، اور ہر قوم وملت میں قابلِ تعظیم۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّد

چنانچہ خدا کے فضل سے واقعتہً بھی ایسا ہی کہ ہر مذہب وملت والے جو حضرتؑ کے حالات صبر واستقلال سے واقف ہیں آپ کی بڑی عظمت کرتے ہیں۔ گویا آپ زندوں کی طرح فرمانروا ہیں۔ اور ہندوستان میں تو ہمارے ہندو بھائی حضرتؑ کی پوری عزاداری کرتے ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو اس وقت حضور مہاراجہ بہادر گوالیار سے دریافت کرے کہ حضور کی ریاست میں سالانہ موازنہ کے اندر محرم شریف کا خرچ کس قدر کیا جاتا ہے[1]۔ جہانتک میں خیال کرتا ہوں کسی مذہب کے پیشوا کے لئے دوسرے مذہب والے اگر بہت کرتے ہیں تو اتفاقیہ کسی کی خاطر سے کچھ بطور عطیہ کے دیدیتے ہیں مگر ہمارے آقا حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے لئے تو لاکھوں ہندو محض صدق دل اور سچے اعتقاد سے بلا کسی کی ترغیب وتحریص کے لاکھوں روپیہ ہر سال خرچ کرتے ہیں اور اس میں ترقی کر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ تمام اقالیم کے مورخین نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے صبر واستقلال کی بڑی تعریف کی ہے۔ لیکن ہزار افسوس کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہی اُن کی تحقیر وتوہین کرتے ہیں اور آپ کی شانِ مُبارک میں کریہہ الفاظ "اپنی سزائے اعمال کو پہنچے" استعمال کرتے ہیں۔ شرم! شرم!!

ایک بات اور قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام کا سارا خاندان صبر واستقلال میں یکتائے روزگار ہے۔ اہلبیتِ طاہرین کا حال تو آپ نے سُنا کہ شبِ عاشورہ اپنے اپنے

[1] حضور مہاراجہ بہادر گوالیار کی طرح حضور مہاراجہ بہادر اندور بھی محرم اور عزاداری سے دلچسپی رکھتے ہیں اور حضور ممدوح نے علاوہ سالانہ موازنہ میں ایک معقول رقم مقرر فرمانے کے ایک عزاخانہ بھی تعمیر فرمایا ہے جو اندور کی قابلِ دید عمارتوں میں ہے۔ سید منظر علی

فرزندوں کو تلقین کرتی تھیں کہ آج جانبازی کا دن ہی ہرگز ہرگز قدم پیچھے نہ ہٹانا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد شہادت بھی اہلبیتؑ نے اُسی صبر و استقلال سے تمام مصیبتوں کو برداشت کیا اور خاندانی اعزاز و توقیر کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس باب میں سب چھوٹے بڑے یکساں متحمل و مستقل رہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ

آخر میں آپ حضرات سے بکمالِ ادب و تعظیم چند سوال کرتا ہوں۔ براہ کرم غور فرمائے اور دیکھ لیجئے کہ آپ کا علم و یقین کیا جواب دیتا ہی۔

(۱) جس بزرگ کو میں نے بحیثیت ایک فرد فرید کے مجرد واقعات سے ایسا عالی وقار ثابت کیا ہی اُس کے ساتھ ہم لوگوں کو کس قدر ہمدردی کرنی چاہیئے ؟

(۲) ہماری اور جمہور مسلمانوں کی ہمدردی اُس بزرگ کے ساتھ کس قدر ہونی چاہیئے جب یہ معلوم ہو کہ یہ عالی وقار ہمارے رسولِ اکرم صلعم کا پیارا فرزند ہی جسکو آپ کاندھے پر چڑھاتے تھے اور اپنا ثمرِ زندگانی خیال فرماتے تھے ؟

(۳) ہمیں اُس بزرگ کے ساتھ کس قدر ہمدردی کرنی چاہیئے اور اُس کے فضایل و مصائب و مراتب کی یادگار قایم کرنے میں کس قدر انہماک کرنا چاہیئے جب یہ معلوم ہو کہ یہ بزرگ جس نے ایسے مدارجِ اعلیٰ حاصل فرمائے ہمارے جدِّ امجد تھے ؟ اللہ اکبر ! ! !

(۴) جمہور مسلمانان کو اُس بزرگ کے ساتھ کیسی ہمدردی کرنی چاہیئے اور کس قدر اور کس طریقے سے اپنی ہمدردی اور شکر گذاری کا اظہار کرنا چاہیئے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس بزرگِ عالی وقار والا ہمم نے یہ سب مصائب اس لیے برداشت کیے تھے کہ بروزِ قیامت اُس کو ایسا درجہ حاصل ہو کہ درگاہِ شاہنشاہِ قہار و جبار کے سامنے اُسکو ہم سے گنہگاروں کی شفاعت کا موقع ملے اور ہماری جان بچائے ؟ ورنہ بذاتِ خود اُس کا بہشت میں جانا تو روزِ ازل سے معین تھا۔

حسینؑ اور خصائل سازی

(نوشتہ جناب مولوی سید ریاض علی صاحب ریاض مولف شہید اعظم)

کسی کے نزدیک اگر عنوان کے الفاظ مبہم ہوں تو مجھے اُن کے مبہم تسلیم کرنے میں عذر نہیں ہے۔ لیکن کہنا یہ ہے کہ میں نے اُن کی شرح کا ارادہ کیا ہے، اور بالارادہ ایسے الفاظ منتخب کئے ہیں جنہیں کافی لچک ہو، اور وہ اس خیال پر حاوی ہونے میں میری مدد کریں جنکے ظاہر کرنیکی خواہش ہے۔

۱۔ عنوانِ بالا سے خیال ہو سکتا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جو حسین کی خصایل سازی میں مُعین ہوئے؟ اور

۲۔ وہ کون سے اسباب حسینؑ کی ذات نے پیدا کئے جو بنی نوعِ انسان کی خصائل سازی میں مدد دے سکتے ہیں؟

پہلی بات ایک تاریخی معاملہ ہے؛ یعنی کچھ ایسے اسباب اور کچھ ایسے نفوس تھے جنھوں نے حسینؑ کی خصائل سازی میں مدد دی۔ یہ ایک ایسا بسیط مضمون ہے جس کے چند صفحوں میں گنجایش ممکن نہیں۔ امر دوم کہ آیا حسینؑ کی ذات نے کچھ ایسے اسباب پیدا کئے یا نہیں جو خصایل سازی میں معین ہوں؟ یہ ایک ایسی بات ہے جس نے اپنی فطری حیثیت سے خصائل سازی کے نشان چھوڑے، اور حسینؑ کی ذات اب ایک ایسی ذات ہے کہ اگر دنیا میں خصائل سازی کے لئے کچھ ذرایع ہیں جو کام میں نہیں لائے جاسکتے تو جب حسینؑ کے اُس تشخص کی شرح کیجائے گی جو اُنھوں نے قایم کیا، تو نہ صرف کوئی فرد، مجموعۂ افراد اور گروہ دیکھے گا کہ اس میں خصایل سازی کی بہترین قابلیت ہے، بلکہ اُس سے بلند تر ایک بین الاقوامی پسند کی خبر پائے گا، اور

اس طرح حسینؑ کا تشخص بلا امتیازِ مقام، وقت، زمان اور رنگ کے اہل عالم کا ایک عام ورثہ ہوگا۔

قبل اس کے کہ میں اُن دونوں حیثیتوں پر نظر کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ خصائل کی شرح میں لکھے جائیں جس سے یہ دشواری نہو کہ آخر خصلت کہتے کسے ہیں۔

میں یقین دلاتا ہوں کہ خصلت کی تعریف کے لئے مناسب الفاظ نہیں پاتا۔ سقراط کی مدد بھی اس ناقابلِ بیان حالت کے لئے کوئی تراشی اور خشک کی ہوئی تعریف مہیا نہ کرسکیگی۔ پھر بھی کسی کے سامنے یہ لفظ استعمال کردو اور تم دیکھو گے کہ اُس کا تمام قیافہ سمجھائے دیتا ہے کہ وہ سمجھ گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اُسے اپنی شرح کے لئے ویسی ہی دشواری ہے جیسی انسانی روح کو۔ طبیب، فلسفی، سائینس داں، ہر ایک کے پاس اپنے علم و فن کے ہر درجۂ ترقی کے مواقف، ایک شرح ہے، پھر بھی اُسے طے کرنا پڑتا ہے کہ ہماری تعریف کی چُول کہیں سے ڈھیلی ہے۔ لیکن کسی انسان سے پوچھو کہ تم روح کو سمجھتے ہو یا نہیں، اور وہ حیرت کرے گا کہ اس ظاہر حالت کے لئے بے سود اقرار کرنے کے معنی کیا ہیں۔ پس روح اور خصلت کے سمجھنے کی دشواری ہے جس کے لحاظ سے میرا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں ایک قوی مماثلت ہے۔ اپنے خاصہ، اپنی ساخت، اپنی قابلیت میں نہیں، اپنی شرح اور اپنی تفہیم میں۔

ہم نہیں جانتے کہ روح مفرد ہے یا مرکب لیکن خصلت کے متعلق یہ قطعی اور حتمی تصفیہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی مفرد شئے کا نتیجہ یا نام نہیں، بلکہ ایک مجموعہ کا نام ہے۔ مجموعہ جس کے مفرد عناصر کے نام ہیں انسان کی صحیح الحواسی (مادی اور روحانی)، اُس کا عمل، مقام، آب و ہوا، دیگر طبایع کا اُسکی طبیعت پر عمل، قوت تصفیہ، جماعتِ انسانی کی روش اور اُس میں اخلاقی حس کا پیدا ہونا، قبولیت، جگہہ کرنا اور عادت ہو جانا، اُس کا قیافے اور بشرے پر عمل، کسی مفروضہ حالت میں ایک خیال، روش اور عمل سے ربط اور اعتبار۔ اور اِن باتوں کے قایم ہونے کے بعد وضح لفظوں میں توریث، فضا اور تربیت ہے، جسکے بعد کسی کے خصایل پر اجتہاد کی آسانی ہو۔ اور کیوں؟ جب یہ باتیں کسی کی جزوِ عادت ہو جاتی ہیں تو باتیں نہیں بلکہ نگاہ میں ایک تشخص

قایم ہوجاتا ہے' ایک انسان کے خصایل کا اپنے تشخص کی بنیاد پر اثر ہوتا ہے۔
جس طرح کوئی فرد اپنی کسی خصلت کے لئے ممتاز ہوتا ہے اسی طرح قوم کا مجموعی جسم بھی کسی خاص خصلت میں ممتاز ہوتا ہے۔ مثلاً قومیں ہیں جو اپنی شجاعت اور کرختگی کے لئے ممتاز ہیں' قومیں ہیں جو اپنی نرمی اور بزدلی کے لئے ممتاز ہیں' قومیں ہیں جو نرمی اور سختی کی بین بین حالتوں کے لئے مشہور ہیں' قومیں ہیں جو اپنی شیریں بیانی اور لہجہ کی خوبصورتی کے لحاظ سے زبان زد ہیں۔ اسی طرح کوئی قوم مکر و فریب' کوئی عقل اور کوئی مشقت کے لحاظ سے نوک زبان ہے۔ یہ منفرد خوبیاں یا کمزوریاں ہیں کسی قوم یا قوموں میں۔ ایک یا ایک سے زیادہ بھی پائی جاسکتی ہے' اور وہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہوسکتی ہے' یا بہت سی برائیوں میں ممتاز ہوسکتی ہے۔ ایک تیسری حالت بھی ہوتی ہے جسے مرکب خوبی کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس میں متضاد حالتوں کی خوبیاں پائی جائیں' مثلاً شجاعت کے ساتھ رحم اور فراخ دلی کے ساتھ احتیاط یا احتیاط کے ساتھ فراخ دلی' صاف گوئی کے ساتھ تمیز وغیرہ وغیرہ اس کے عکس میں نامردی کے ساتھ بے رحمی' جھوٹ کے ساتھ فریب' بے اعتباری کے ساتھ خیانت اور نا احسان شناسی کے ساتھ ظلم ہے۔
کسی فرد میں کسی یا چند خوبیوں کا پایا جانا کسی اتفاق کا نام نہیں ہے' بلکہ اس شخص کے ارادہ' خیال اور عمل کا اس مخصوص روش پر چلنا اور اسے اپنا جزو کرلینے کا نام ہے' اور اس روش کا قایم ہونا کچھ وقت کا محتاج ہے۔ اور جب کسی منفرد شخص میں کسی روش کا قایم ہونا ایک عمل کا کام ہے' تو قوم جو افراد کے مجموعہ کا نام ہے' لازم زیادہ وقت' قوی تر فضا اور تربیت کی محتاج ہے کہ وہ کسی خاصہ یا خصایل کے لئے مشہور ہو' اور کوئی تشخص قایم کرے اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ خصایل یا خاصہ کوئی گوند یا لاکھ نہیں ہے کہ ایک دفعہ لپٹا تو چھوٹنا نہیں جانتا' بلکہ قوم اور فرد کا خاصہ دریا کی طرح جزر و مد میں مبتلا رہتا ہے۔ کبھی گھٹتا ہے اور کبھی بڑھتا ہے۔ اس کے لئے قوموں کے عروج و زوال پر غور کرو

تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ قومیں جس وقت بڑھیں ظاہراً بڑھنے کے قبل وہ کچھ اسباب میں گھری تھیں جو خصائل سازی کر رہے تھے، اور جب اُس کے نشو و نما کی ایک حد پہونچی تو قوم بڑھ گئی۔ اس کے بالعکس جب کسی قوم کے زوال پر غور کروگے تو تمہاری سمجھ میں آجائے گا کہ وہ قابل تعریف خصایل سے یا تو لاپرواہ ہوگئی تھی، اس پر ہنسنے لگی تھی، یا اُس کے احساسات کمزور ہوگئے تھے۔ اور اگر نظر کو وسیع کرنے اور دُور جانے میں تردد ہو تو اپنے ہی کو دیکھ لو کہ تم کیا تھے؟ اور کیوں تھے؟ کیا ہو سکتے ہو؟ اور کیونکر؟۔

ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی خیال کرلو کہ ایسی تو بہت کم مثالیں ہیں کہ کسی ترقی یافتہ قوم نے بے غرضی سے کوئی بے خصایل یا کمزور خصایل کی قوم کو صاحب خصایل اور قوی تر خصایل کی قوم بنایا ہو، بلکہ اس کے بالعکس تم ایسی مثالیں ہر زمانہ میں پاؤگے کہ ایک قوم دوسری کو کس طرح پست تر بنانا چاہتی اور اُسکے قومی خاصّہ کو محو کرنا چاہتی ہے، یا کمزور کرتی جاتی ہے کہ وہ رقابت یا مقابلہ کے قابل نہ رہ سکے۔ میں یہ بھی نہ بھولونگا کہ قوموں کے ساتھ نہ خدا کی عزیز داری ہے نہ عداوت، تم یا کوئی اور اُس وقت سے بڑھیگا جسوقت سے قانونِ ترقی کا ساتھ دیگا، اور تم یا کوئی اور گھٹے گا جس وقت سے اُسے پست روی کی عادت ہو جائے گی۔ یہ غلط ہے کہ چونکہ کوئی بڑھ کر گھٹ چکا اب وہ نہ بڑھیگا، یا چونکہ کوئی گھٹ کر بڑھ چکا اب وہ زوال سے محفوظ ہوگیا۔ نہیں! کسی کے بڑھ جانے یا گھٹ جانیکے بعد قانون عروج و زوال معلق یا ختم نہیں ہوگیا۔ بڑھو اگر تم چاہو، گھٹو اگر تم چاہو!

"اگر چاہو" میں بلحاظ گنجائش نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک وقت میں کھڑے کھڑے ایک پاؤں اُٹھا سکتے ہو، دونوں نہیں اُٹھا سکتے۔ اور جس وقت کوئی سمجھتا ہے کہ وہ ایک پاؤں اُٹھا سکتا ہے، یا دونوں ساتھ اُٹھائیگا تو گر پڑے گا، وہ ایک قانون سمجھتا ہے اور قانون کا اعتبار قایم کرتا ہے۔ نوع انسانی نے ایک زمانۂ مدید سے خدا کے قانون کا تجربہ کیا ہے، تجربہ نے امتیاز پیدا کیا ہے اور اب وہ یہ کہنے کے قابل ہے کہ سُنت الٰہی میں جہانتک انسان جانتا ہے،

تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ سیپ میں جوار کا دانا اور جوار کے کھیت میں بحرِ عماں کا موتی ملے۔ قانون نے ہر ایک کے لیے ایک حد مقرر کی ہے جس کے اندر وہ کام اور نتیجہ کا اُمیدوار ہو سکتا ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز میں ایک قانون ہے تو عروج و زوال کے لیے کوئی قانون نہ سمجھنا یا اس قانون کے پیدا کیے ہوئے نتیجہ کو ابدالآباد تک کے لیے مصلوب کر دینا قانون کی غلط فہمی ہے عروج و زوال کی فطری روش میں اُس وقت غیر فطریت شامل ہو جاتی ہے جب اُس میں غیر قوموں کی رقابت شامل ہو جاتی ہے اور جس وقت رقابت غلبہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہ غلبہ سیاسی وہم غلبہ کو ظلم کی حیثیت میں مسخ کر دیتا ہے اُس وقت عروج کی کوشش کے لیے سہوی رکاوٹ اور زوال کے عدم انسداد کی لاپروائی زوال کو سریع کر دیتی ہے جو معدومیت پر منتہی ہوتی۔ تم نے سنا ہوگا کہ کبھی بابلی، اسیری اور ہٹ قومیں تھیں جن کے نام سے وہ قومیں کانپتی تھیں، جہاں تک اُس زمانہ کے سلسلۂ آمد و رفت کے لحاظ سے اُن کا قدم پہونچ سکتا تھا۔ کیا ہوئیں؟ اُن سے قوی تر اقوام نے کچل دیا، یا اُن میں معدوم ہو گئیں، جو اُن کے بعد بڑھیں ہندوستان کی ناقابلِ مس قومیں کون ہیں؟ وہ جن پر آریوں کا دستِ تسلط دراز ہوا، اور اُن کے فاتحانہ طنطنہ نے مغلوب قوم کی معاشرت کو ذلیل سمجھ کر، یا اُنھیں آئندہ نہ بڑھنے دینے کی مصلحت سے معاشرتاً پست تر سمجھا، اور اُن کے لئے ایسے قوانین بنا دیئے جو اُنھیں ایک جگہ گاڑ دیں۔ پھر بھی انفرادی عروج و زوال سے اُن کی تعداد بڑھتی اور گھٹتی رہی۔ لیکن چونکہ آریوں کا نظامِ سیاست دائمی نہ تھا، ناقابلِ مس قومیں اپنے کو اپنی ذلیل حالت سے نکال سکتی تھیں، اگر اُنھیں فکر ہوتی۔ نکل گے سنبھلیں فکر تھی۔ اور اگرچہ آریوں کا سیاسی نظام دائمی نہ تھا لیکن اُن کے تسلط نے جو نظامِ معاشرت قایم کیا تھا وہ اُس سے زیادہ دیرپا تھا، اور یہ نظم اپنی قایم شدہ حالت، جماعت، روایات اور مذہب کی بنیاد پر اپنے سلسلہ کو جاری رکھیگا جبتک کہ اُس میں قوت رہیگی۔ ورنہ وہ شکست ہو کر ناقابلِ مس میں شامل ہوگا اور پھر وہاں سے

عروج کی خواہش قوی تر نظام میں جذب کرتی جائے گی۔ آریا قوم نے مذہب کی لچک کو غالب رکھا ہوتا، یا انسانیت کو زیادہ دخل دیا ہوتا تو آج ہندوستان کی ناقابل مس قوم نہ ہوتی، یا دوسرے لفظوں میں آریت قوی تر ہوتی، کیونکہ اُس میں قوت جاذب پیدا ہو جاتی۔

اس تمام بیان سے میرا یہ مطلب ہے کہ وہ انفرادی عروج و زوال ہو یا قومی، اُسے خصائل سے بڑا ربط ہے۔ وہ قوم زوال پذیر نہیں ہوتی جس کے خصائل درست ہیں اور وہ قوم بڑھ نہیں سکتی جس کے خصائل یا ترقی کی بنیاد درست نہیں ہے۔

ان مختصر اشاروں میں میرا قلم پھسل نہیں گیا ہے بلکہ اُسقدر چلا ہے جسقدر چلنا چاہیئے تھا اور اب اس کے بعد مجھے "تعیین اور خصائل سازی" کے سمجھانے میں نسبتاً آسانی ہے۔

اب قبل اسکے کہ میں اپنے عنوان کے دونوں پہلوؤں سے بحث کروں میرے مضمون کو "سرزمینِ عرب کی طبیعی حالت" اور "قوم عرب اور اُس کے خصائل سے بحث کی ضرورت ہے۔ یہ ایک روندی ہوئی زمین ہے، جس سے میں بجز چند الفاظ اور چند اشاروں کے کچھ نہیں چاہتا، اور یہ بھی اس لئے کہ میں آیندہ کچھ کہنے کے لئے بعض خیالات کو زندہ کر دوں جس سے میرے مضمون کے سلسلۂ خیالات میں شکستگی نہو۔

جغرافیائی حیثیت سے ایک ملک جس کا موقع تھا کہ اُسے نہ صرف رومی، یونانی، ہندوستانی اور ایرانی قوموں سے کسی حیثیت کا ربط ہوتا، بلکہ عرب کے بنادر وہ پل ہوتے جس طرف سے یورپ اور افریقہ مشرقی ایشیا سے اور مشرقی ایشیا افریقہ و یورپ سے ملے ہوتے۔ گذرگاہ جس سے میری غرض دنیا کی مشہور قوموں سے ربط اور شناسائی ہے اور قومی تعارف کے بعد میری غرض یہ بھی ہے کہ اُن میں ہر ایک کا تمدن، مذہب، اخلاق اور ان سب سے ملکر جس کا جو خاصہ تھا اُس کا ایک دوسرے سے تصادم ہو رہا تھا، اور ایک محسوس یا غیر محسوس تموج کام کر رہا تھا۔ ابھی درجہ سے بحث نہیں ہے۔ اس تموج کا اثر اگر مذہباً دیکھا جائے تو میں یہ کہنے پر مجبور رہوں اور میں غالباً سند دیسکوں گا کہ وہ شمار کے قابل نہ تھا۔ اس کی کچھ وجہ بیان کرونگا تین ہزار

برس میں چند یہود قبایل کا ہونا اگر وہ عرب بھی ہوں، زیادہ قابلِ تعریف نہ تھا، اگرچہ اسکے آثار ہیں کہ بیت المقدس کی تاخت کے وقت اکثر یہود وہاں سے منتقل ہوکر یہاں آگئے تھے اُن کے علاوہ اِکّا دُکّا عیسائی۔ یہ خارجی اثر تھا اگر اثر کہا جاسکے۔ مذاہب خارجی عرب پر کیا اثر کرتے جبکہ عرب کے مشرکانہ اصول اُن میں سرایت کرجاتے تھے۔ صابئین دُور کے نہ تھے۔ بُت پرستی اوہامِ فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس کے لئے نہ کسی مقام کی ضرورت ہے نہ زمانہ کی۔ اگرچہ یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ قومیں اپنے مذہب سے سمجھی جاتی ہیں، لیکن ہم جس زمانہ کے قریب کا ذکر کررہے ہیں اُس میں عرب کا مذہب اگر کچھ ہو، اُسے اُس کے خاصہ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اور وہ مذہب کو اپنے خاصہ کے موافق موڑتا تھا نہ کہ مذہب اُس کے خاصہ کو موڑتا ہو عرب بھیڑ بننا پسند نہ کرتا۔ یہ اُس کے خاصہ کے قطعاً مغایر تھا۔ وہ بھیڑ تھا ہی نہیں کہ بھیڑیا بننا اُس کے لئے کوئی فخر کی چیز ہوتی، اور یہ اُس کے شجاعانہ وحشت کے بالکل منافی تھا کہ وہ بھیڑیا ہوکر بھیڑ کا بھیس اختیار کرتا۔

یہود عرب کی خصایل سازی نہ کرسکتے تھے۔ اس لئے کہ اُس وقت صدیاں گذر گئی تھیں کہ اُن کے دماغ سے حکومت کی بُو نکل گئی تھی، اور جب سلطنت نہ تھی تو یہ سپاہی نہ ہوسکتے تھے، کیونکہ نہ اب حُبِّ وطن اور حُبِّ قوم کا وہ درجہ تھا جو آزاد قوم میں ہونا چاہیئے۔ حُبِّ مذہب جیسی کچھ اُن میں تھی وہ بجائے خالص یہودیت کے ایک زمانہ سے شرک میں رنگی جاچکی تھی۔ یہود عرب میں متناہی تشخص قایم کرسکے وہ کچھ تو عرب کی طوائف الملوکی اور کچھ اپنی تجارت اور سودخواری کی بدولت۔ یہود عرب کے حاکم نہ تھے کہ مجبوراً مفتوح قوم کی کسی حیثیت کی خصایل سازی کا ذمہ لیتے، نہ وہ معاشرتاً ایسی درگذر والی قوموں میں سے تھے کہ دوسرے انسان کو بھی خدا کا بندہ سمجھتے۔ اب صرف اضطراری معاملت جس قدر اثر کرتی وہ بجز اسکے کہ خودغرضی ہوتی، کبھی عرب کو کھُلے ہوئے سینہ سے اُن کی طرف نہیں بڑھا سکتی تھی۔ قرآن مجید میں تم پاؤ گے کہ اہلِ کتاب عربوں کیساتھ خیانت وغیرہ کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جُہلائے عرب کے ساتھ

اس طرح کی معاملت کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اپنے مہذب تر ہونیکا کیا اچھا ثبوت اور برتاؤ تھا!

اور سچ تو یہ ہے کہ یہود کی تاریخ یہ نہیں کہتی کہ اپنے خصائل میں جنبش کے قابل نہ تھی۔ کب انھیں موقع ملا کہ وہ بعل اور اشتروت کی طرف نہ جھکے اور زہرہ کی خاص کنیزوں کے فریفتہ نہو گئے؟ اور کب باوجود سخت احکام کے اُنکی لگام ڈھیلی ہوئی اور اُنھوں نے بت پرستی شروع نہ کر دی؟ میں اس پر آمادہ ہوں کہ اُن کی یورپ کی تاریخ کو ایک بڑی حد تک مستثنیٰ کر سکوں یا اشاعتِ اسلام کے بعد اُنھیں قوی تر موجد پاؤں۔

نہ مسیحیت کی تثلیث اُسے اپنا فریفتہ کر سکتی تھی۔ تین سو ساٹھ خدا کیا کم تھے جن میں اضافہ کی گنجایش تھی۔ اگر اُس سے کہا جاتا "میں تلوار کرنے آیا ہوں"۔ خوب! وہ تمہاری شمشیر زنی کا درجہ بڑے غور سے دیکھتا اور اُسے پسند آتا تو اُس کا طبعی میلان قبول کر لیتا۔ لیکن اُس سے کہئے کہ "میں ساس بہو کو لڑوانے آیا ہوں" تو وہ فوراً بدل جاتا۔ وہ عورتوں کے ساتھ کسی ایسے معاملات کو جائز نہ سمجھتا تھا، اس لئے کہ عورتوں کی حمایت اور اُن کے استغاثہ پر جان دینے کیلئے آمادہ ہو جانا ایک لامعلوم زمانہ سے اُس کے صحیفۂ عزت میں داخل تھا۔ کہو کہ "میں صلح کرنے کو آیا ہوں" اور وہ نہ صرف دونوں فقرات میں تضاد پائیگا، بلکہ اُس کے مزاج اور اُس کی روایات کے موافق بھی نہوگا۔ کہو کہ "ایک تھپڑ کھا کر دوسرا گال بھی سامنے کر دو" اور اسکے لئے تیار رہو کہ کیا جواب دیگا!

اُسکا خاصہ تو یہ ہو گیا تھا کہ اگر کوئی کانٹا چبھتا تو جھکنا عیب سمجھتا تھا، اور اگر دشمن اُس کے کسی عزیز کو قتل کرتا تو اپنا رونا کمالِ حمیت سے، دشمن کی شماتت کے خوف سے، انتقام لینے تک ملتوی رکھتا تھا۔ دورنگی اُسے پسند نہ تھی۔ اُسے نیزہ، گھوڑا اور اس پر تند نشست کی عادت تھی۔ اونٹ یا خچر نشانِ صلح یا عورتوں کے لئے تھا۔

زردشتیت اُسے اپنا گرویدہ بنا سکتی اگر کسی کتب مقدسہ کے "جانور غذا" عرب میں آکر اُس کے پیٹ میں اُتر جاتے۔ کہاں اُسکی سیماب خصالی اور کہاں بارہ ہزار برس کا انتظار کہ جب ایزد فتح

پائیگا تو نیکی غالب رہیگی! رہا اُس کا سب سے خلوص سے سجدہ کرنا جو اُس کے معدہ کا لحاظ کرتا وہ اس کے لئے مجبور تھا۔

سرزمین عرب کی طبیعی حیثیت سے پہاڑ، ریگستان، صاف آسمان، خشکی، بے گیاہی، گوشت خوری، کمی معیشت، اکثر شکار کی سخت کوشش کے بعد حصولِ غذا، حصولِ معیشت کے لئے کڑے سفر، خانہ جنگی ان باتوں نے اُسے درشت، بیخوف، سیدھا اور شجاع بنا دیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شریف سپاہی نہو، لیکن بہادر ضرور تھا۔ ایسا نہ تھا کہ بھیگی بلّی بنا رہتا، اور اُسکی غرض اور اس کا مزاج اُسوقت ظاہر ہوتا جب کمزور چڑیا اُس کی زد کے اندر آجاتی، یا وہ پچیتیاں کرتا رہتا اور فریب کی ہر زبادتی کو تدبّر کہتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سپاہی (اعلیٰ مفہوم میں) مدبر ہوسکتا ہے، مُدبّر (پست تر اخلاقی مفہوم میں) سپاہی نہیں ہوسکتا۔ اگر عرب سپاہی تھا، طبعاً پچیت نہ تھا تو اُسکا شجاعت پسند ہونا اُسے صحیح مفہوم کا جیسا بھی مدبر بنا سکتا، پست اور فریبانہ روش کا مدبر نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ سپاہی تھا، ذوفنون نہ تھا۔ اور اگر وہ ایسا تھا تو لازماً اُس کے لئے ایک اصول اور ایک مذہب چاہیئے تھا، جو اُس کے بہترین خاصہ کے موافق ہوتا۔ ورنہ مجبوریاں اُسے ایسے اصول کیطرف لیجاتیں جو مغایر ہوتے تو کبھی مذہب اور خاصہ میں مطابقت نہو سکتی۔ یا تو عرب کا خاصہ مذہب کو ضایع کر دیتا یا مذہب عرب کے خاصہ کو کھو دیتا اور کون جانتا ہے کہ اُس میں جو کچھ اخلاقی یا معاشرتی بُرائیاں داخل ہوگئی تھیں وہ خارجی اثرات سے نہ تھیں۔

کرشمۂ قدرت چاہتا تھا کہ یہ قوم دنیا میں کچھ کرے، لیکن کرتی کیسے؟ اُسے آپس میں لڑنے سے کب فرصت تھی، اُسے بے سود افتخار نے کب وقت دیا تھا کہ وہ کوئی بہتر بات سوچتا اور مذہب نے کب اُس پر اثر کیا تھا کہ اُس کے لئے کوئی دلنشین قانون ہوتا؟ وہ کیا کرتا، بجز اس کے کہ اپنے جوش میں سموم کی طرح چکر کھاتا۔ اُسے فساد، خانہ جنگی، قتل، اختلاف، لامذہبی اور بے اخلاقی کا پورا تجربہ تھا۔ یہ ہوا اور عرب کے لئے سب کچھ ہے۔ کون کرتا جب سلطنتیں نہ کرسکیں؟ کون کرتا جب صدیوں کے نظامِ روحانی نہ کرسکے؟ صدیوں میں نہ کرسکے! لیکن ہونے والا تھا سلطنت

سے نہیں، روپیہ سے نہیں، تلوار کی باڑھ سے نہیں، نیزے کی انیوں سے نہیں، گوشت اور خون کے اُنھیں کے ایسے انسانی شکل کے انسان سے! کسی پارلیمنٹ سے نہیں، کسی نظام شخصی یا جمہوری سے نہیں، ایک فردِ واحد سے!!

ذرا سوچو سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، ملکوں اور قلیموں پر روحانی سیلاب آیا، صدیوں پیشتر کی بنی ہوئی سلطنتیں، قومیں اور اُن کا تشخص فنا ہوگیا، وہ بدل گئیں۔ زمین، آسمان، فضا، توریث، خاصہ، روایات، سب بدل گئے۔ کس نے بدلا؟ کیونکر؟ ایک شخص نے! باریکی کی لاٹ یا نور کے ستون سے؟ سونے اور چاندی کی دلفریب مدد سے؟ دھمکی، خوف، یا فریب سے؟ نہیں اُسی لفظوں سے دور حالت سے جسے خاصہ کہتے ہیں۔ یہود کا بہترین ربی، مسیحوں کا بہترین ڈاکٹر آف ڈِوینٹی، سائنٹسٹ فلسفی اور بایو لوجسٹ کو یقین نہیں دلا سکا کہ کیونکر نور کا ستون موجود ہوگیا تھا اور کیونکر کوئی مُردہ زندہ ہوسکتا تھا؟ لیکن اُن سے کہو کہ افراد اور قوموں نے خاصہ میں تغیر پیدا کر دیا، مردہ قومیں جی اُٹھیں، کاہل اور لاپرواہ کارآمد اور ذی ہوش ہوگئے، شیطان کے اُستاد ولی اللہ بن گئے اور وہ سر جھکا دے گا۔ اس لئے کہ یہ حالت انسان کی نگاہ سے قریب تر اور دل کے احساس سے نزدیک تر ہے، جس میں کسی ساحرانہ فریب یا شبہ کی گنجایش نہیں۔

خاصہ کی حرارت تھی جس نے عرب کو موم بنا دیا، اور وہ موڑا گیا جس طرح اُس کا موڑا جانا ایک فرد کے لئے ضروری تھا، جس میں ایک حقیقی مفہوم کے انسان کی طرح زندگی بسر کرنیکی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔ ذرا سی شرح! یہ تو گوتم بدھ سے لیکر دنیا کے سب سے بڑے جاہل اور گنا ہگار کو معلوم ہے کہ نیکی اچھی چیز ہے اور بدی بُری، عقلمند کی بات سنو اور مانو اور احمق سے بچو، لیکن ایسی ذات کس قدر ہیں جن میں خوبیاں ہوں ہوکر اُن کا ایک جزو بنگئی ہوں اور اُنھوں نے ایک اعتبار پیدا کر دیا ہو، اور جاننے والوں کے خیال سے دُور ہوگیا ہو کہ ایسا شخص کبھی اپنی روش سے ہٹ سکتا ہے۔

الحق! وہ ذات اقدس تھی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جس نے قبل نبوت اپنی عقل، صداقت، صحیح تصفیہ، دیانت اور امانت کا یقین دلا دیا تھا۔ گھر کے لوگوں میں تجربہ کار حضرت ابوطالب سے زیادہ جاننے والا اور زیادہ معترف دوسرا نہ تھا۔ کچھ باہر حضرت خدیجہ تھیں جو معاملت اور فراست کی ایسی شیدا بن گئیں کہ خود سے تحریکِ عقد کی۔ اور صداقت کا وہ مجمع قایل تھا جو اُن کے دعوائے نبوت کا ابھی قایل نہوا تھا اور امین تو نام ہی پڑگیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ حُبِ وطن اور رسول کی حمایتِ ضعفاء سے بھی لوگ ناواقف نہ تھے۔ شاید کوئی انسان مجھ سے یہ نہ پوچھیگا کہ رسول کی جرأت کا ذکر کرو۔ مورخین جانتے ہیں کہ کیسے کیسے وقت پڑے اور گویا ہزار ہا دشمنوں میں تنہا رہ گئے، جگہ چھوڑنا کیسا، ہمیں اور ہر جاننے والے کو، عام اس سے کہ مسلم ہو یا غیر مسلم علیؑ کی شجاعت کی قدر ہے، کہتے ہیں کہ خطرہ کے وقت ہم لوگ رسول کی پناہ لیتے تھے۔ لیکن اس سے عظیم تر جرأت یہ تھی کہ ہم تنہا دنیا کا خیال پلٹ دینے کے لئے کھڑے ہوں گئے بُت کیطرح عقاید ہنود میں ترمیم نہیں، مسیحیت کی طرح یہودیت کی شرع کا اختلاف نہیں، بلکہ عالمگیر بُت پرستی اور شرک کے خلاف علان۔ دوربینی اور نکتہ رسی یہ تھی کہ قیصر اور کہاں ایران کا تاج وتخت دکھا دیا تھا۔ انسان شناسی یہ تھی کہ قانون بنا دیا جو حوائج مقام اور زمان پر حادی ہے تھا اور رہیگا، جبتک انسان انسان رہیگا۔ اب شاید مجھے مثالوں میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے اور صرف یہ کہدینا ہے کہ یہ اکیلا نفسِ مقدس وہ گہوارہ تھا جس میں قوم پل رہی تھی۔ ایک دارالتربیت تھا جس میں قوم کی تربیت ہو رہی تھی۔

عرب کیونکر بدل گیا؟ قلب ماہیت کا معجزہ کیونکر ہوا؟ اس طرح کہ عرب کی تمام باتوں کو قایم رکھا، بلکہ موقع موقع سے اُسکی داد دی۔ اُس میں اچھی باتوں کو اُنگلی رکھکر پہچنوایا، اُسکی قدر پیدا کر دی۔ ابتداءً مشہور بُرائیوں کو نہ کرنے کا حلف لے کر بُرائیاں پہچنوا دیں، اور خدا کے خوف اور محبت کے قطرے اس طرح ٹپکائے کہ عرب کے بہرے کان سننے لگے اور اندھی آنکھ دیکھنے لگی۔ کوئی ایسا اصول نہیں بنایا کہ چونکہ کوئی امیر ہے اسلیے مستحق عذاب ہے، نہ افلاس کو

انسان کی حقیقی ذلت سمجھا۔ ایک کو دوسرے کے اور اپنے حقوق بتا دئے اور دونوں سے کہدیا کہ تم میں خدا کے نزدیک زیادہ مکرم وہ ہی جو زیادہ متقی ہی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ ایک وقت مسلمان اپنے مصلے پر خدا کا عاجز بندہ تھا، تو دوسرے وقت اُسے اپنی پیٹھ پر اپنے اہل و عیال کی معیشت کے سامان لانے میں شرم نہ تھی، تیسرے وقت وہ تجارت کرتا تھا یا زمین کھودتا تھا، اور چوتھے وقت میدانِ جنگ میں وہ خوفناک سپاہی تھا جسکے سامنے کیانِ ایران اور قیصرانِ روم کی فوجیں کارآمد ثابت نہوئیں۔ میں فوجیں کہہ رہا ہوں جسکے معنی یہ ہیں کہ کسی قوم کی فوج اُس کی ہر طرح کی ترقی کا لُب لباب ہی۔ اس سے سمجھا جائیگا کہ اُس کا نشو و نما، جسمانی، دماغی، اخلاقی، حُبِ قومی قربانی کہاں تک ہی۔ کہاں تک وہ فوج مصائب برداشت کرسکتی ہے، اور کس طرح اپنے عزیز احساسات کے لئے، خوشی سے ہر مصیبت کو ہیچ سمجھتی ہے۔ اُس فوج کا دل کس قدر قوی ہی اور اس میں کس حد تک قلبی یکجہتی ہی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ چند سال بعد اسلام کا سریع السیر اثر ہزاروں میل میں پھیل گیا۔ مجھے یاد آتا ہی کہ کسی اہرام مصری کے کھودتے وقت ایک کتبہ نکلا تھا کہ ہم نے چھ برس یا چھ مہینے میں اسے بنایا تھا، تم اسے ساٹھ برس میں کھود ہی دو! بڑی حد تک اسے اُن خصائل سے مماثلت ہی جو مسلمانوں میں پیدا کئے گئے تھے۔ سلطنتیں بنتی اور بگڑتی تھیں اور بجھتی ہوئی آگ پھر بھڑک کر ایک دوسرے خطے میں زمین کو روشن کردیتی تھی۔ یہ آگ کیا تھی؟ کوئی اتفاق تھا؟ کوئی بڑی عمدہ قسمت تھی؟ کسی دماغ کی کارگذاری تھی؟ یا کوئی خواب تھا جو پورا ہوتا تھا؟ یہ سب کچھ نہ تھا خصائل کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، روایات سامنے آجاتی تھیں، بلند توریث میں ہیجان ہوتا تھا، اور جب یہ پُرانے سامان مہیا ہوجاتے تھے مسلمان پھر اپنی گری ہوئی حالت سے سنبھل جاتے تھے۔

عجب متعدی عکس تھا کہ عربوں سے ایرانیوں، افریقیوں، تاتاریوں، یوروپینوں اور ہندیوں تک منتقل ہوتا رہا، اور ہر ایک میں اُسی ذاتِ اقدس کا جلوہ دکھائی دے گیا جو ایک زمانہ تک غارِ حرا میں اپنے کو چھپائے رہی!

مجھے افسوس ہے کہ کمی وقت اور مشورہ کے جثہ کے لحاظ سے ایسے دلچسپ مطالعہ میں قصر نظر کی مجبوری ہے اور اب میں کمی کرنے کے لحاظ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ دیکھو کہ اُس حیرت انگیز ذات نے کیسے کیسے لوگ تیار کئے جسے لوگ قتل کرنے آتے تھے اور غلام بن کر رہتے تھے، بُرا بھلا کہتے اور جب توجہ کے عالم میں مس ہوتا تو اُنھیں بجز مدح کے چارہ نہ تھا۔ اس بلندی خصائل نے ہادی عالم کے خیال کی پاکیزگی، ارادہ کی قوت، نفس کی ذکاوت، احساس کی لطافت اور ادراک کی تیزی پر کیا اثر کیا تھا؟ اس کے آثار اُس بزرگ کی زبانی کافی ملتے ہیں جسے مطالعہ کا کافی موقع تھا، اور تاریخ کو تاریخ کی طرح پڑھنے والے بھی اپنے مدارج کے موافق ناآشنا نہیں ہیں لُب لباب یہ ہے کہ نئے آدمی پر ہیبت طاری ہوتی تھی اور جوں جوں واقف ہوتا جاتا تھا محبت بڑھتی جاتی تھی۔ لہجہ ایسا صاف جس کے سمجھنے میں کسی صحیح الدماغ آدمی کو غلطی واقع نہ ہو۔

خوش نصیب تھے وہ لوگ جو ایسے نفس عظیم کے سایہ میں تھے، اور خوش نصیب ہے وہ قوم جو یہ کہے کہ ایسا بزرگ ہمارا ہے جس سے ہمارے آبا و اجداد کی مس انتہا نے جو اُس وقت تھی اُس ذات عظیم کو دیکھا اور اثر لیا، اور وہ اثر کسی حیثیت سے کچھ نہ کچھ ہم تک منتقل ہوتا رہا ہے، اور موٹے موٹے واقعات نے سمجھنے کا ذریعہ چھوڑا ہے، اگرچہ خصایل کی ابتری نے اُس بلندی خصایل کے صحیح احساس کے قابل نہ رکھا ہو۔ یہ تھے حسینؑ کے جد بزرگوار اور وہ تھی حسینؑ کی قوم جن میں شرافت کے اعلیٰ احساسات اُس شاخ میں خصوصیت سے پائے جاتے ہیں جسے بنی ہاشم کہتے ہیں۔ سلسلہ چاہتا تھا کہ میں حسینؑ کے پدر نامدار، مادر گرامی اور برادر عالی وقار کے خصایل پر کسی حد تک تفصیلی نظر ڈالتا اور اس طرح میرے مضمون کا پہلا حصہ واضح ہو جاتا کہ وہ کونسے اسباب تھے جو حسینؑ کی خصایل سازی میں معین ہوئے۔ بہتر ہو گا کہ میں اسے کسی مناسب وقت کے لئے اُٹھا رکھوں اور جسے میں نے کسی حد تک کہیں دکھایا بھی ہے۔ حامی اسلام کے متعلق اس قدر کہنا شاید کافی ہو کہ ایک ذات جو یہ کہہ سکتی ہے کہ اگر فریب ہی تدبر ہے اور میں ایسا کر سکتا تو سب سے بڑا مدبر ہوتا، یا جو ایسے موقع پر جس کیلئے قوموں نے جائز رکھا ہے کہ "جنگ میں سب جائز ہے" وہ اس پر خوش ہو

کہ ہم حق سے نہیں ہٹ، وہ جو ابن عباس کے ایسے دعوے کو کہ میں ایسی ایسی ترکیبیں کروں کہ فلاں شخص سوچتا ہی رہجائے، یہ کہ کر رد کر دیتے ہیں کہ مجھ میں نہ تمہاری خصلتیں ہیں اور نہ فلاں کی، جو یہ کہہ سکتا کہ مجھ سے یہ ممکن نہیں کہ میں چیونٹی کے منہ میں سے ایک ذرہ بہ جبر چھین لوں، جو مسلمانوں کے آپس کے کشت وخون کے خوف سے اپنے جائز حوصلوں کو لگام دیتا ہے اور مختصر لفظوں میں جس کی تعریف اُس کا دشمن اور خود قاتل کرے۔ محال تھا کہ ایک ایسا شخص انسان اور اُس کے خصایل سے ناواقف ہوتا۔ اس بزرگ کے مشہور خطبات میں اکثر وہ ہیں جو انسان کا مطالعہ کہے جائیں۔ دیکھو کہیں مخفی سے مخفی غلطیوں پر متنبہ کیا ہے اور کیسے لطیف سے لطیف احساساتِ پسندیدہ کی طرف رغبت دلائی ہے۔ مبالغہ سے کہیں کم ہے یہ فقرہ کہ یہ بزرگ شرح رسول تھا۔ یہی جو رسول کی اس طرح متابعت کرتا تھا جس طرح اونٹ کا بچّہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ یہی تربیت کا اصل اصول ہے۔ سیکھو تو سکھانے کے قابل بنو گے۔ سوچنے کا صحیح طریقہ سیکھو اور پھر تم نہ صرف غلط روی خیال سے محفوظ ہو جاؤ گے بلکہ تمہارے عمل پر اس کا عکس پڑے گا اور علیٰ ہذا القیاس۔ اس ذاتِ اقدس نے بھی مثالی لوگ بنائے جنھیں اس بزرگ کے دنیا سے گذر جانے کا ایسا غم تھا جیسے ماں کی گود میں بچّہ ذبح کیا جائے کیوں؟ غصّہ میں حلم، انصاف، مظلوم کی حمایت، حق گوئی اور اُس میں ملامت سے لاپروائی، درگذر، ایسا بزرگ اس قابل تھا جس کی محبت میں شہید ہونے والوں کی تعداد دنیا کے کسی مصلح اخلاق سے کم نہو گی، اگر زیادہ اور عظیم تر نہ کہی جائے۔ جسکی محبت خون نے آزمائی اور پوری اتری کیوں؟ بلندیٔ خصایل۔ یہ نفس جس کے حلیہ کا ایک عکس "کثیر التسبیح" ہے ضایع ہو سکتا تھا! جس کی ہیبت سے لوگ بات نہ کر سکتے اور اُس کے دشمن اپنے اوپر غالب آنے میں اُسکی مدد کرتے۔ یہ تھا حسینؑ کا پدرِ عالی مقدار۔

حسینؑ کی مادرِ گرامی وہ معظم جسکی ہادیٔ عالم تعظیم کر سکتا، جس کا ایک لقب "ام ابیہا" تھا، جو اہلِ صفہ کے لئے اپنے آرام و زینت کی چیزیں قربان کر سکتی، جو خلق اللہ کے لئے اپنے کو

نہیں اپنے دو چاند کے ٹکڑوں کو بھوکا رکھ سکتی، جو اگرچہ ملاحظہ فرما سکتی ہے کہ وہ چیزیں جو
انسان کے آرام و آسایش کے کام آسکتی ہیں ہمارے گھر سے تقسیم ہوتی ہیں لیکن کبھی اپنے
پدر بزرگوار اور زوجِ نامدار کے فیصلہ سے اعراض نہیں فرماتی۔ تسلیم و رضا، اعتبار اور نظر
کہ یہ مخلوقاتِ خداوندی کے کام آرہی ہیں، ہم نے افلاس میں بسر کرکے دوسروں کو راحت دی
ہے، غربت کی تلخی کم کرنے کا علاج بہترین علاج جو ممکن تھا، صبر اور شکر اور تکلیفیں۔ بلند
ہوتا ہوا دیکھتی ہیں اور اپنا اثر منوانے میں اپنے کو عاجز پاتی ہیں۔ یہ معظمہ اس قابل تھیں جو
فرما سکتیں کہ عفت عورتوں کا بہترین زیور ہے۔ عفت بول رہی تھی۔ دیکھنے والے کہتے
ہیں کہ عادات، رفتار، گفتار اور لہجہ میں اس معظمہ سے زیادہ مشبہ بہ رسول کوئی نہ تھا۔
کیسے ہوتا! کوئی تھا کہ سیدۃ النساء العالمین خطاب تھا۔ یہ ذات مقدسہ تھی جسکے متعلق
ہاشمی ابنِ عباسؓ ایک موقع پر یہ کہہ سکتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ شیرنی مع اپنے بچوں کے بیٹھی ہے۔
اُن کے پاس خمس خیبر کہاں! بدر، خندق حسنین وغیرہ وغیرہ کی غنیمت کجا! خود ہیں اور
آسیا سائی۔ لوگ کہتے ہیں کہ خادمہ سے کام لیجیے اور فرماتی ہیں کہ وہ بھی آخر بندۂ خدا ہے۔
رحم و کرم نے اُن کی صورت میں جنم لیا تھا۔ یہ تھیں وہ معظمہ جنھوں نے حسینؑ کی گہوارہ
جنبانی کی تھی، دودھ پلایا اور پالا تھا۔ تم نے سُنا ہوگا کہ رسول کے پاس جبرئیل آئے اور
اُنھوں نے حضرت کو جنابِ امام حسینؑ کی شہادت کی خبر دی۔ ایک محضر جس پر خود حضرت
فاطمہؑ نے دستخط یا مہر کی۔ اِس اشارہ سے۔۔۔۔۔ نہ میری غرض ہے کہ تم سے وحی کی بحث
کروں، نہ یہ کہنا اور لڑنا ہے کہ آسمان پر بھی کوئی کاغذ کا کارخانہ ہے جہاں سے محضر کا ٹکڑا
آیا تھا۔ میرا نقطۂ اقدام یہ ہے کہ یہ روایت ہے، سمجھ لو کہ یہ استعارہ ہے۔ کیونکہ الفاظ مسائل
ناممکن الحل میں کافی نہیں ہوا کرتے۔ سوچو کہ تم ہوش کے عالم میں ہو، سو نہیں رہے ہو،
جاگتے ہو اور تم پر یہ خیال چمکتا ہے۔ بات ہوئی نہیں ہے، آیندہ کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ
وہ خوف کی ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ خوشی کی ہو، اور ہوتی ہے! تم جانتے ہو اور انسانی

تجربہ جانتا ہے۔ اس چمک کے وقت تمھیں یقین نہ تھا اور جب بات ہوگئی تو تم نے یاد کیا۔ کیا رسول کے نفسِ عظیم اور ضمیرِ مطہر کو اِس چمک سے محروم کروگے ؟ اس کے ساتھ ہی رسول کا نفسِ معظم اس کا اس طرح احساس کرتا ہی کہ گویا ہونے والی بات ہی۔ تم اسے اتفاق ہی کہو مجھے اس سے بحث نہیں۔ ان تمام مراحل کے بعد اب وہ ضمیرِ روشن اپنی لاڈلی بیٹی سے فرماتا ہی کہ اگر ایسا وقت آئے تو تم حسینؑ کے اصول پر قربان ہونے کے لئے راضی ہو یا نہیں؟ اور سیدۃ نساء العالمین اس بلند غرض پر اپنے گود کے پالے کے قربان ہونے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ میں سمجھا چکا، یہ تھیں حسینؑ کی مادر گرامی !۔

حسنؑ مجتبےٰ، حسینؑ کے برادر معظم، اسلام کے شاہزادۂ صلح، زبانی نہیں عملی! قوت واغنیاء کے باوجود جنھوں نے کئی مرتبہ اپنا نصف مال راہِ خدا میں تصدق کر دیا جنھیں یہ گوارا نہ تھا کہ کھانے کے وقت کوئی جانور مُنہ دیکھتا رہے اور خود کھاتے رہیں، ایک نوالہ خود نوش فرماتے ہیں اور دوسرا اُسے دیتے ہیں، ایک لاثانی انسان شناس مدبر جو قومی خاصہ کو ملاحظہ فرما کر صحیح نتیجہ پر پہونچتا ہے اور بیسوں کوشش کے کشت وخون سے خلق اللہ کو محفوظ رکھتا ہی۔ یہ تھے حسینؑ کے برادر معظم جن کے ساتھ حسینؑ بچپن میں کھیلے تھے۔

یہ تھے وہ نفوس اور اُن کے مختصر خصائل جن کے سایہ میں حسین، حسینؑ ہوئے تھے۔ کربلا کے مشہورِ عالم حسینؑ اور اُن کا محیر العقول صبر، استقلال، حق روی پر باوجود ناقابل برداشت مصائب کے بڑھتا ہوا اصرار، تسلیم ورضا کا کمال۔ یہ باتیں حسینؑ میں روز عاشورہ دفعتاً نہ پیدا ہوگئی تھیں، بلکہ ایک زمانہ کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ تربیت، توریث اور فضا تو تھی ہی لیکن حسینؑ ہی تھے جنھوں نے اصول کو اپنا کر لیا تھا۔ ہر انسان اپنے عمل میں مختار ہی لیکن حسینؑ جنھیں رسولؐ نے اپنا جود اور اپنی شجاعت عطا فرمائی تھی، اُنھوں نے جس طرح اور جن اسباب میں شہادت گوارا فرمائی اپنے کو اصول کا مجسمہ قرار دیدیا تھا۔ اُن کی شہادت اُن تمام چیزوں کی شہادت تھی جو عالم، عرب، انسان اور اُس کے اعمال وخیال میں بہتر ہے۔ اور اسی

شہادت کی نوعیت تھی جس نے حسینؑ کی جسمانی فنا سے حسینؑ کی صفات کا ایک ایسا تشخص قائم کر دیا جو ابد الآباد تک فنا ہونے سے محفوظ ہو گیا۔ حسینؑ اپنی حیات میں تو ایک تھوڑی سی جگہ پر رہتے تھے، اب اُن کے تشخص کی سکونت اُس وقت سے آج تک کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں تھی اور رہی۔ وہ قبل شہادت مدینۂ طیبہ میں سکونت پذیر تھے، اب کونسی جگہ ہے جہاں مسلمان ہیں اور حسین نہیں۔ جہاں تاریخ ہے اور حسینؑ نہیں؟ جہاں بولنے والے ہیں اور حسینؑ نہیں؟ نہیں بلکہ حسینؑ اور اُن کا ذکر، اُن کے خصائل کا ذکر زمانہ اور عالم اثیری میں ساری ہو گیا، کہاں نہیں ہیں؟۔ تمام عالم اُن کی داستان گاہ ہے، ہر شجاع دل اُن کا قصہ خواں ہے۔ اور ہر شریف انکا مدح ہے۔ کربلا میں تو صرف حسینؑ کی لوح مزار ہے، حیات اُنھیں ایسا جسم بسیط نہیں بنا سکتی تھی۔ کونسی قوم ہے جو حسینؑ کو اپنا بنا سکتی تھی اور نہ بنائی؟ قومیں تو اکثر فرضی اور مصنوعی شہید بنا لیتی ہیں اور مسلسل تحریک سے ایک فرضی تشخص کو حقیقی بھیس میں دکھاتی اور اُسے اپنے قومی اور سیاسی اغراض کے کام میں لاتی ہیں۔ ہمارا شہید عالم کا شہید ہے، اور اصولِ خیر اُس کی قربان گاہ ہے۔

کوئی قوم جو حسینؑ کو اپنا شہید کہہ سکے اگر زبانی ادعا سے آگے بڑھکر عملی حیثیت میں قدم رکھے، وہ اپنے قدم پر اپنی شجاعت کا ثبوت دیگی۔ وہ قوموں کی تند تنقیدی نگاہ کو مدعو کریگی اور دیکھنے دیگی کہ ہم غربا اور مخلوقات پر ایسے رحیم ہیں، متکبرین کے لئے ایسے بے حرکت ہیں، رضاے خدا پر اس طرح پیش قدمی کرتے ہیں، اصول کی اس طرح نگہبانی کرتے ہیں۔ اس طرح مخلوقات کو تہلکہ سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ یا اپنی جان اور ذلت کی زندگی جاہو یا عزت کی موت مرو تو موت کی طرف اس طرح دوڑتے ہیں کہ اُس سے زیادہ کسی کی بغل گیری اور زیارت کا حوصلہ ہی نہ تھا۔

اخلاق کے طویل لیکچر آسان ہیں، اپنی بھیڑوں کا گوشت کھاکر چیر بد ارباتیں کرنا سہل ہے، عمل اُس سے بدرجہا مشکل ہے۔ عمل کا اس قدر پاکیزگی خیال سے مضبوط ہو جانا کہ قابل جنبش نہو، اُس سے مشکل ہے۔ خوبیوں کا عین خاصّہ ہو جانا گویا انتہا ہے۔ پھر بھی

مرنا مشکل ہے۔ خصوصاً اپنے ذاتی تعلق کے لئے نہیں، اصول کے لئے۔ بات آسان ہوتی تو درجہ شہادت اپنی اس بلندی پر نہ ہوتا۔ کچھ ہے جو ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ قوم کا یہ نقطۂ آماجِ خیال ہے۔ شہیدِ وطن، شہیدِ ملت اور شہیدِ مذہب ہر ایک عزیز ہے، اور وہ عزیز ترین ہے۔ جو ایک مجموعہ کی حفاظت میں شہید ہوا۔

کیا مجھے کہنا ہوگا کہ حسینؑ کیوں شہید ہوئے؟ تفصیلی نہیں تفصیل بہت طویل ہوگی لیکن عرب کی درستی خصائل کے اشارہ سے میری کچھ غرض تھی! غرض یہ تھی کہ درستیِ خصائل کا مدرسہ جاری ہوئے ظاہر ظہور تہتّر برس ہوئے تھے کہ اُس میں بنی ہوئی قوم میں یہ تغیر ہوا کہ اپنے ہادی کا گھر کربلا میں برباد کر سکتی۔ معمولی تباہی نہیں، نیست و نابود کرنے کا ویسا ہی ارادہ جیسا حسینؑ میں اصول کی حفاظت کے لئے فنا ہو جانے کا مصمم عزم تھا۔ تم جانتے ہوگے کہ دودھ پیتے اور تتلاتے ہوئے بچے بھی قتل ہو گئے۔ قوم کی احسان شناسی، رحم و کرم، انسانیت حقوق کا لحاظ، مریضوں اور عورتوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق ہادی کی تعلیم کیا ہو گئی؟ - سیاسی وہم پر قربان کر دی گئی۔ اسی دن کے لئے رسولؐ نے قوم بنائی تھی، اسی دن کے لئے علیؑ نے سرکشانِ عرب کے سر کچلے تھے اور فتوحات کی طرف لے گئے تھے کہ جب تم مال و زر، حکومت و اختیار، سامان و آلاتِ حرب پر قابض ہو جانا تو انھیں حسینؑ پر آزما لینا!

لیکن ایک قوم تھی جو تمام احساساتِ شرافت اور انسانیت کو قدموں سے روند سکتی تھی، اور حسینؑ کو اپنا شریک بنانا چاہتی تھی، تو وہ جسے ہادیؐ کے لختِ جگر نے دودھ پلایا تھا اپنی اکیلی گردن اُن کے اعمال و خصائل کے خلاف احتجاج کے لئے بلند کرنے کو موجود تھا۔

میں اُس شخص کی بات سنونگا جو یہ کہے کہ حسینؑ اپنی روش کے نتائج سے واقف نہ تھے۔ اُسے جواب سننے کی ذمہ داری اپنے سر لینی ہوگی۔ مختصر لفظوں میں حسینؑ کی حیات جن اوقات اور اسباب میں گذری تھی، اُن میں اپنے کو سمجھانے کی کافی صلاحیت تھی، اور وہ اس قدر مختلف انواع کے تھے جو اکثر انسانوں کے موقع اور اتفاقات سے بعید

تر ہیں۔ ایسے موقع اور اتفاقات میں کسی بشر، کسی شخص کے متعلق ایسا اعتراض کہ اُسے اپنے افعال کی نوعیت، اثر اور نتیجہ سمجھنے کا تجربہ نہ تھا ایک جری تجاہل ہوگا، اور میں ایک مرتبہ اُس شخص کی صورت دیکھونگا جو یہ کہے کہ حسینؑ نے اپنے کو تہلکہ میں ڈالا۔ اِس وقت اس قدر سوال اور بس کہ اُس کے دفترِ غیرت میں آیا کوئی امکانی وقت جان دینے کا ہے یا نہیں؟۔

حسینؑ کے سامنے ایک قوم بنی تھی۔ بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، قوم گرکی طپش دل اپنے سینہ پر محسوس کی تھی، ہادی کی زبان اپنے منہ میں دیکھی اور چوسی تھی۔ مرتے مرتے سینہ پر لَوٹ لئے تھے، اپنے کانوں اور آنکھوں سے سُنا اور دیکھا تھا کہ رسولؐ ہمارے بارہ میں اُمت سے وصیت کر رہے ہیں، سُنا تھا کہ جدِّنامدار، پدرِ عالی مقدار اور مادرِ گرامی میری شہادت پر راضی ہو چکی ہیں اور اب دیکھتے ہیں کہ وہ جو اُمتِ رسول کا عنانگیر کہا جائے ایسا ہے جس پر انسانیت، اخلاق اور اصول کو شرم آئے۔ جس کی بعض بلکہ اکثر باتیں وحشیوں کیلئے باعثِ ننگ ہوں، وہ ہم سے اُس سے جس میں رسول کا ہے بیعت کا اصرار کرتا ہے۔ بیعت، مخالفت نہ کرنے اور مطابعت کا عہد! جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یعنی نواسۂ رسولؐ کے اقرار سے جاننے والوں کو مشتبہ اور نہ جاننے والوں کے لئے اُن افعال کی تصدیق کرالے!

تو جس طرح حسینؑ کا کربلا والا شخص ایک زمانہ دراز کا عمل تھا، حسینؑ کے مخالفوں کا ایسا ہونا جیسے وہ ظاہر ہوئے ایک زمانہ کے ہیجانِ عظیم کا نتیجہ تھا۔ میں خوش ہوں کہ اس مفید، باریک اور مغز پاش مطالعہ کو پبلک کا ورثہ قرار دے چکا ہوں۔ اس جگہ اس کے کہنے سے یہ غرض ہے کہ اب وہ دن پہونچا تھا کہ دینِ حسرت دیاس سے بقیہ اصحابِ عبا کی طرف دیکھ رہا تھا کہ تم اس عظیم الشان مخالفت کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو یا نہیں؟ تم ایسا تموج پیدا کرسکتے ہو یا نہیں کہ لوگ عموماً جس رنگ میں رنگے ہیں اُس سے الگ

بھی کچھ دیکھیں اور سوچیں؟ آیا تمہاری آواز اس قدر قوی ہے یا نہیں کہ تم بھی قاتلوں سے کچھ کہہ سکو؟ اور الحق! حسینؑ کی قوتِ روحانی اور اُس کے عظیم الشان تغیر نے اپنے قاتلو سے کہلوا دیا کہ ہمارا خزانہ، ملک، فوج اور اثر حسینؑ کے اُس تصفیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ

وان تکن الا بدان للموت انشاءت

فقتل بالسیف فی سبیل اللہ افضل

یعنی اگر انسان کے ابدان موت ہی کے لئے بنے ہیں تو راہِ خدا میں تلوار سے مارا جانا افضل ہے۔

اور حسینؑ کے اُس گلوے بریدہ نے جس پر رحمۃ للعالمین کے بوسوں کی مُہر تھی ایسی صدا بلند کی جس نے خواہی نخواہی خلق اللہ کو اپنی مدح کا ہمزبان بنایا اور دشمنوں کو ابدالآباد کے لئے ذلت اور شرم سے دبا دیا۔

قوم کیوں ایسی ہوگئی؟ اس کی تشریح اس وقت میری زد کے اندر نہیں ہے۔ نہ میں بہت سی مثالیں دونگا، نہ صرف یہ مثال کافی ہے کہ سپہ سالارِ لشکر عشرۂ مبشرہ میں کے ایک کا لڑکا ہے، جس کی اور جس کے باپ کے جسم کی چربی اور شخصیت اُن کے گھر نے بنائی تھی۔ قتلِ حسینؑ اور ملکِ رے کی حکومت کا موازنہ کرتا ہے اور قتل حسینؑ کا تصفیہ کرتا ہے! خود غرضی، منفعت، ناحسان شناسی، حق و باطل کا عدم احساس، زر پرستی، حصولِ امتیاز، وہ کسی طرح ہوا اب اُس قوم کا خاصّہ ہو گیا تھا جسے رسولؐ نے ایثار، اور احسان شناسی، حق کی محبت، باطل سے نفرت اور تقوائے سے درجہ امتیاز کا سبق دیا تھا۔ اور اس سبق کو اُلٹا اُس پر صرف کیا گیا جس سے بڑھکر کسی اور سے رسولؐ کا ایسا قلبی تعلق دریافت کرنا مشکل ہے، اور روایت تو یہاں تک ہو کہ رسولؐ نے اپنے فرزند ابراھیم کو حسینؑ پر قربان کر دیا کس نے؟

حسینؑ منی و انا من الحسین

نہیں سُنا ؟ کسے حق تھا بجز اُس کے جو رسول کا ریحان اور پھول تھا کہ وہ تعلیم رسولؐ کی اُن اُن عظیم تشخیص اور عمل کی خالص خوشبو دنیا میں پیش کر سکتا ؟ کس کی زبان میں یہ قوت تھی جو ایک عالم کی مخالفت کے باوجود کہہ سکتا کہ تربیت یافتگانِ آغوشِ پاکیزہ عزت کی موت پر ذلت کی زندگی پسند نہ کرینگے۔ بجز اُس موتی کے جو اصلابِ بلند اور ارحامِ مطہرہ سے منتقل ہو کر رسولؐ کی گود میں آیا تھا اور زبان چوسی تھی ؟

اپنا بہترین ہوش، شجاعت، استقلال، غور اور اندازہ صرف کرو اور دیکھو کہ اکیس ہزار تلواریں، تیر، نیزے، پتھر اور آگ ہے جس کی حسینؑ پر بارش ہے، سپاہیوں کا دریا اور اُن کے جسم اور نفس کی مجموعی قوت ہے، ہیبت ناک شور اور برافروختہ گھوڑوں کا حملہ ہے لیکن اُن سب نے حسینؑ کے اُس تنہا ہاتھ میں رعشہ نہیں پیدا کیا جو دین کے وقار اور اُسکی لطافت کی نگہبانی کے لئے بلند تھا، وہ گردن نہیں جھکائی جس پر حسینؑ کا سر تھا۔ وہ سر جو تمام خوبی کا خزانہ تھا، جس پر قومیں مرتی اور حوصلہ کرتی ہیں۔

اگر شہادت ہی کسی مذہب کی فضلیت کا معیار ہے تو ہم عالم سے چاہیں گے کہ وہ اسلام کے اس شہیدِ اعظم کا ایک کوئی شہید پیش کرے، اگر شہادت کسی قوم کے اعلیٰ خصائل کا ثبوت ہے تو ہم کہیں گے کہ لاؤ کوئی مقابل جو ہمارے اس اشرف الشرفا کے کارنامے کی روشنی کم کر دے، اور اگر شہادت ہی روحانی ارتقا کا ثبوت ہے تو ہم کہیں گے کہ لاؤ کوئی شہید جو اپنے آنے والے مصائب کے خیر مقدم کے لئے حسینؑ کی طرح پر حسرت و شوق سے بے چین ہو، جو تسلیم و رضا کا ایسا سبق دے گیا ہو کہ تیروں کے فرش پر آرام فرماتا ہے، جس کی زبان اقدس پر جاری ہے :-

" صبراً علی قضائک یا رب لا الٰہ سواک یا غیاث المستغیثین "

کیوں وجودِ خداوندی کے اثبات کے لئے فلسفہ کے متناقض مباحثہ میں اُلجھتے ہو ؟ کیوں نہیں اُن بندوں کے اعتبار و یقین کو دیکھتے جنہوں نے خدا کی حقیقی حکومت قائم کی

درآنحالیکہ اس سے انہیں کوئی دنیاوی نفع نہ تھا؟ وہ موحد بنکر کوئی دنیا امتیاز حاصل نہیں کرتے تھے جو اعلانِ الحاد کا سافیشن ہو۔ حسینؑ کے صفات کی تفصیل اسلامی تاریخ نہیں ہے مجھے مثالوں کی ضرورت نہیں، صرف یہ کہنا ہے کہ کوئی قوم جو بگڑ گئی ہو اور بنا چاہتی ہو، یا جو انفرادی دوستی خصائل سے قومی تر قوم بنانا چاہتی ہو وہ حسینؑ کے مدرسہ کی شاگرد ہو۔ یہ حسینؑ تھے جنہوں نے اپنی مثال اور اہل بیت کی تعلیم سے لوگوں میں اُن کے ساتھ ہمدردی کا وہ ہیجان پیدا کر دیا جس نے بنی اُمیہ کی عظیم الشان سلطنت کو حباب کی طرح توڑ دیا۔

ہم جو مختلف فضا، اثرات اور قوموں کے مدارج نشو ونما میں گھرے ہیں، ممکن ہے کہ اپنے انحطاط اور زوال سے اور زیادہ گر جائیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ حسینؑ روحِ اسلام کا پتہ دینے والے چراغ ہیں اور حسینؑ ہی ہماری مُردہ ہڈیوں کے لئے خرقیل ہو سکتے ہیں۔

بادوستاں تلطف!

حبیبؑ ابن مظاہر رئیس کوفہ، امام حسینؑ کے بچپن کے ساتھیوں اور جاں نثار رفقاء میں سے تھے۔ بعض اور خالص احباب کی طرح انھیں بھی یہ شرف حاصل ہوا کہ مکہ سے چل کر، عراق کی ایک منزل پر حضرت نے انہیں اپنے دست مبارک سے خط لکھا، اور خاص ایلچی کوفہ بھیج کر یاد فرمایا۔ حبیبؑ خود اپنے آقا کی زیارت کے لئے بیچین تھے۔ حجاز سے حضرت کے آگے بڑھنے کی خبر مل چکی تھی لیکن کوفہ کی سمت تشریف لانے کا صحیح راستہ معلوم نہ تھا، اسلئے اب تک خموش بیٹھے تھے۔ آقا کا خط پاکر گویا، شادی مرگ ہوگیا اور اُسی وقت تعلقات سے آزادی حاصل کرکے چل نکلے، اور حضرت سے جا ملے! عاشور کو جب سوا جنگ کے ہر راہِ چارہ مسدود دکھائی دی تو ناچار امام حسینؑ بھی مستعد بہرگ و جنگ ہو گئے۔ اس دفاع میں حبیب کا قدم نوجوانوں پر بھی سبقت لے گیا اور دشمنوں کا حملہ روکنے میں اس ضعیف العمر سپاہی نے سپر کا کام دیا!!۔

امام حسینؑ کا اپنے دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا، اور اس برتاؤ اور سچّے خیال ڈبے ریا دل نے اُن کے جاننے والوں اور دوستوں کو کس قدر اُن کا گردیدہ و جاں نثار بنا دیا تھا، اُس کی ایک مثال ذیل کی حکایت اور بندوں میں ملے گی، جسے تمامی دنیا اور خصوصاً مسلمان (اور علی الخصوص اُس کی اُس مختص جماعت کو جو اُس عالی حوصلہ بزرگ کا نائب ہونے کی مدعی ہے!) کو خوب غور سے دیکھنا اور پڑھنا چاہیئے تاکہ وہ اپنے دلوں کو ٹٹول سکیں کہ اب صداقت و سلوک کی کتنی گرمی اُن میں باقی رہ گئی ہے؟ اور حسینؑ کا نام صرف زبان اور معمولی آنسوؤں کے ذریعہ سے جاری ہو رہا ہے یا واقعی اُن کی تعلیموں کا کوئی اثر بھی

اُن میں دکھائی دیتا ہے؟
حسینؑ کے بھی وہ سلوک اور خالص برتاؤ تھے، اور در اصل اسی میں وہ کرامت تھی جس نے ہزاروں کے مقابلہ میں اُن کے بہتر غمخواروں کو یوں کھڑا کر دیا جس کی مثال دُنیا پیش کرنے سے قاصر رہ گئی! ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اور وہ قوم جو اُس برگزیدہ ذات سے اپنے آپ کو وابستہ دکھلاتی ہے، اُس عالی نفس کی تعلیموں پر بھی غور کرے اور اپنے کو اُن کا سچا پیرو ثابت کر دکھائے۔

سب فوج کو سلام کا جب دے چکے جواب
بس جانبِ فرس متوجہ ہوئے جناب
روح الامین نے دی یہ صدا تھام کر رکاب
"بسم اللہ اے خدیو زماں مالک الرقاب
"نورِ محمدی۔ رُخِ انور کی ضو میں ہے"
"شوکت تری رکاب میں نصرت جلو میں ہے"

اس شان سے فرس پہ شہِ انس و جن چڑھے
جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے
بہرِ جہاد راہِ خدا مطمئن چڑھے
گھوڑوں پہ نوجوانوں سے پہلے مسن چڑھے
سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں
پیدل مگر تھے ابن مظاہر[1] رکاب میں

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دمبدم
گردن میں وہ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
ہر نوجوان سے تھا یہ اشارہ۔ بصد حشم
یعنی جہاں سے جائینگے پہلے جناں میں ہم
بر میں زرہ۔ کمانِ کیانی تھی دوش پر
قبضہ پہ ایک ہاتھ تھا ایک زین پوش پر

ابرو جھکے جو پڑتے تھے آنکھوں پہ بار بار
رومال پھاڑ کر اُنھیں باندھا تھا اُستوار
آنکھوں سے شیرِ نر کی جلالت تھی آشکار
گویا کہ تھی غلافِ میں حیدر کی ذوالفقار

[1] حبیب ابن مظاہر رئیس کوفہ ۱۲

چلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے

اک شور تھا کہ عود کیا پھر شباب نے — پائی دعا حبیب کے حق میں جناب نے
ریشِ سفید رُخ پہ سیہ کی خضاب نے — پائی یہ آب و تاب کہاں آفتاب نے
لبریز نور سینۂ بے کینہ ہو گیا،
یوں جھریاں مٹیں کہ تن آئینہ ہو گیا!

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہِ نامدار — "یہ کس لئے پیادہ روی اے نحیف و زار"
"میں بھی اُتر پڑوں گا۔ ہو گے اگر سوار!" — کرتے تھے عرض یہ کہ "توانا ہے جاں نثار!"
"ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم"
"ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم"

فرمایا "تم کو دیتا ہوں اُس سر کی میں قسم" — "جو بعدِ عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم"
"میں بھی نکالتا ہوں رکابوں سے لو قدم" — "اچھا تمہارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم!"
"چھوٹیں جہاں میں بحرِ مصیبت کو جھیل کے"
"ہم تم تو ایک گھر میں پلے ساتھ کھیل کے"

"وہ لوٹنا بھی خاک پہ۔ اب تک ہے یادگار" — "تم پر بھی گرد تھی۔ مری زلفوں پہ بھی غبار"
"اس روز تم پہ مجھ سے سوا تھا نبیؐ کا پیار" — "فرماتے تھے۔ یہ ہے مرے پیارے کا دوستدار"
"شبیرؑ کے حبیب کو پہچانتا ہوں میں"
"لوٹے گا یہ لہو میں یوں ہی جانتا ہوں میں"

رو کر کہا حبیبؑ نے "آخر ہوا وہ دور" — "اب اُن کا دور ہے کہ جو ہیں حاکمانِ جور"
"یہ وقت اور کچھ ہے۔ وہ ہنگام تھا کچھ اور" — "مولا کبھی رہا نہیں دنیا کا ایک طور!"
"گردش نئی فلک کے نئے انقلاب ہیں" — "کوثر ہے جن کا۔ آج وہ محتاجِ آب ہیں"

یہ عرض کرکے روئے حبیبؑ وفا شعار
جھک کر کہا "یہ پیر غلام آپ پر نثار!"
جبتک سمند پر وہ دلاور ہوا سوار
روکے رہے لگامِ فرس۔ شاہؑ نامدار!

ہر دوست پر پدر سے زیادہ شفیق تھے
کیا قدرداں وہ شاہ تھا اور کیا رفیق تھے!!

(انیس)

با دشمنان مدارا!!

امام حسینؑ کوفہ کی راہ میں ہیں مسلمؑ و ہانی کی خبرِ شہادت اور یزیدی لشکر کے اِدھر روانہ ہونیکی خبریں برابر ملتی جاتی ہیں کہ یکایک ایک منزل میں ایک دستہ فوج ملجاتا ہی۔ خوب جانتے ہیں کہ ان میں کا ایک ایک ہمارا دشمنِ جانی اور تشنۂ خون ہی۔ لیکن ان کی مصیبت کا حال سُن کر اور شدتِ عطش کی کیفیت معلوم کرکے رہا نہیں جاتا۔ اور قلب بے چین ہی۔ اُن کی دشمنیوں کو اس وقت فراموش کردیتے اور محض اُن کے انسان اور بندۂ خدا ہونے کو یاد رکھتے ہیں! حکم ہوتا ہی کہ "ساتھ کا کُل پانی انھیں پلاکر سیراب کردو"! عباسؑ اس عطا پر دبی زبان سے یاد دلاتے ہیں کہ "منزل سخت۔ راستہ پہاڑ۔ پانی کا قحط اور بچوں کا ساتھ ہی"! مسکت جواب ملتا ہی کہ "ہو۔ اصرار نہ کرو۔ یہ مسلمان ہیں۔ میرے بچوں کا خدا ہی!!" غرض وہ اندوختہ آب انھیں پر تقسیم کردیا جاتا ہی! انسان سیراب ہوچکتے ہیں تو حیوانوں کا حال دیکھا نہیں جاتا۔ بے زبان زبانیں نکالے ہوئے ہیں۔ اس پر قلب بھر آتا ہی اور یہ حکم ہوتا ہی کہ "ہاں۔ ان کی پیاس بھی بجھادو"! جانور بھی ٹھنڈے کئے جاتے اور اُن میں تازہ جان ڈالی جاتی ہی! اس سی فراغت کے بعد چین آتا ہی اور اب اُن کے اِدھر آنے کا اصل مطلب پوچھتے ہیں (ملاحظہ ہو روایت)

یہ ہی ایک ہوا خواہِ انسان اور ہمدردِ بندگانِ خدا کا کیرکٹر! جس کے حالات و واقعات پر آنسو تو بہت بہائے گئے لیکن ابتک قلب میں وہ رقت و نرمی اور گداز پیدا نہ ہوسکا جس میں یہ کیرکٹر جذب ہوسکتا اور ہم انسان بن سکتے! دشمن کے ساتھ سلوک تو خیر اور انسان کے ساتھ ہمدردی تو دوسری بات، مسلمان مسلمان کے ساتھ کیا کرتے چلے آئے اور اب بھی کیا کر رہے ہیں؟

یہ دیکھنے اور بڑی عبرت کے ساتھ دیکھنے کی بات ہے۔ وہاں اُس حالت پر بھی وہ مسلمان سمجھے اور سمجھائے جا رہے ہیں اور یہاں بیشتر اپنی جماعت و دائرے سے خارج کئے جا رہے ہیں! اور بس نہیں کہ اُن کے ساتھ غلامانِ ترک و دیلم کا سا سلوک کیا جائے۔ اور اس پر بڑا ناز، اپنی عظیم فتح اور بڑی بہادری، اور اپنی بڑی بزرگی سمجھی جاتی ہے! ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم!!

اس زمانہ میں نگہداشتِ حیوانات اور مظالم بر حیوانات کا بڑا شور و غل ہو رہا ہے اور اس کے لئے سبھائیں، انجمنیں اور سوسائٹیاں بنائی جا رہی ہیں۔ اُن کے ہوا خواہ ذرا آئیں اور دیکھیں کہ وہی ہمدردیٔ نوعِ انسان حیوانات پر بھی کس طرح نگاہ رکھتا اور اپنے نانا کی تعلیم اور اپنے باپ کی فرمائشوں (لا تجعلوا بطونکم مقابر الحیوان۔ اپنے پیٹوں کو حیوانوں کا مقبرہ نہ بناؤ۔ یعنی اُن پر رحم کرو اور زیادہ گوشت نہ کھاؤ!) کو آج سے تیرہ سو برس قبل کس طرح پورا کر گیا، اور ایک اس واقعہ کو دیکھکر سمجھیں کہ وہ واقعی پوجا جانے کا مستحق ہے یا نہیں؟ مگر واقعی کوئی سمجھے کیونکر؟ کیونکہ کوئی سمجھانے والا نہیں! اس ادعا کرنے والے دل و زبان رکھتے ہوتے تو پہلے خود کو سمجھاتے، درست کرتے اور پھر دوسروں کے سدھارنے کا مُنہ رکھ سکتے تھے! فاعتبروا یا اولی الابصار!!

اُکھڑے جو وہاں سے بھی خیام شہِؑ عالم — خدام سے ارشاد کیا آپ نے اُس دم
"بچوں کی ہمیں فکر ہے اپنا نہیں کچھ غم" — "اُس منزلِ پُر ہول میں پانی ہے بہت کم"
"شہرے جو ہیں پُر آب اُنھیں اونٹوں پہ دھرا!"
"جو مشکیں بکھالیں ہیں۔ وہ سب پانی سے بھر لو!"

یہ سُن کے ہر اک مشک میں سقّوں نے بھرا آب — راہی ہوا اُس بن سے نبی کا گلِ شاداب
گرمی یہ تھی اُس دن کہ کسی دل کو نہ تھی تاب — تھا شعلہ فشاں دشت میں خورشیدِ جہاں تاب
لُو چل رہی تھی، رنگ بھی سونلائے ہوئے تھے — جنگل میں گلِ فاطمہؑ مرجھائے ہوئے تھے!

حضرتؑ بھی چلے جاتے تھے افسردہ و دلگیر — جو ایک دلاور نے کہی گھوڑے پہ تکبیر[1]
اُس شخص سے فرمانے لگے حضرتِ شبیرؑ — "بتلا سبب اس ذکر کا۔ اے صاحبِ توقیر؟"

کی عرض قریب آ کے شۂ عرش نشیں کے،
"وہ نخل نظر آتے ہیں کوفہ کی زمیں کے!"

اور وں نے یہ کی عرض کہ "اے دلبرِ زہرا!" — "خرمے کے یہاں نخل تو دیکھے نہیں اصلا"
عباس علمدار نے جب غور سے دیکھا۔ — کی عرض شۂ دیں سے کہ "فوج آتی ہے مولا!"

"کیا جانیے انبوہ ہے یا چند نفس ہیں"
"نوکیں یہ سنانوں کی ہیں یا گوشِ فرس ہیں!"

شبیرؑ نے فرمایا کہ "سچ کہتے ہو بھائی!" — "یہ فوج ہمارے لئے کوفہ سے ہے آئی"
"ماتم میں کئی روز سے راحت نہیں پائی — "کیا دور ہے گر ہو اسی جنگل میں لڑائی!"

"سرکش ہیں ارادہ نہ کریں بے ادبی کا"
"خیمہ کہیں برپا کرو ناموسِ نبیؐ کا"

یہ کہکے پھرے دھنی طرف سبطِ پیمبرؐ — برپا ہوا نزدیکِ جبل خیمۂ اطہر
پہنچے تھے حرم خیموں میں ناقوں سے اُتر کر — جو آ گیا نزدیک ستمگاروں کا لشکر

سرتا قدم آہن میں جفا کار نہاں تھے
سب ایک ہزار ان میں زرہ پوش جواں تھے

آنے لگے حضرتؑ کی طرف جب وہ جفاکار — عباسؑ یہ للکارے کہ "بڑھیو نہ خبردار!"
"برپا ہے یہاں خیمۂ شاہنشہ ابرار" — "آئینِ ادب سے تمہیں بہرہ نہیں زنہار"

"کچھ عرض جو کرنی ہے۔ تو کریو ٹھہر کر"
"سردار جو آئے بھی۔ تو گھوڑے سے اتر کر"

---

[1] صدائے اللہ اکبر ۱۲

"بے خوف چلے آتے ہو باگوں کو اُٹھائے! | "کیا ہو جو ادھر سے بھی کوئی آنکھ دکھائے؟"
"پیغام ہے کچھ، یا ہو عریضہ کوئی لائے؟ | "تم سب میں جو فہمیدہ و عاقل ہو وہ آئے"
"گر بے ادب آؤگے تو جانا نہ ملے گا"
"ہتھیار بھی باندھے ہوئے آنا نہ ملے گا"

"نے عرض نہ معروض - نہ تسلیم نہ پیغام" | "ٹھہرو وہیں بس! بد ہے اس آغاز کا انجا
"کیا فوج یہاں کوفہ کی - اور کیا سپہ شام" | "گیتی کو اُلٹ دیں، جو بڑھیں تول کے صمصا
"جنگل میں جو اُترا ہے - وہ مختارِ زمیں ہے"
"شیروں کا یہ بیشہ ہے - خبر تم کو نہیں ہے؟"

"گھر سمجھے ہو دربار شہنشاہِ عرب کا؟" | "نے پاس جلالت کا - نہ کچھ دھیان ادب کا"
"ہر چند کرم عام ہے اُس خاصۂ رب کا | "غصّہ بھی نمونہ ہے مگر حق کے غضب
"ڈالوگے اگر رنگ لڑائی کی بنا کا"
"صحرا ابھی بن جائے گا بازار حنا کا"

جنگل میں جو گونجا اسدِ بیشۂ حیدر | دل ہلنے لگے سینوں میں سب تھم گئے
کس پیار سے شبیرؑ پکارے کہ "برادر" | "پوچھو تو ذرا کون ہے سرکردۂ لشـ
"آئے ہیں ملاقات کو - یا قصدِ وغا ہے؟"
"مجھ پر بھی تو ظاہر ہو کہ منظور انہیں کیا ہے؟"

یہ سُن کے پکارا - اسد اللہ کا ضرغام | "تم لوگوں کا سردار ہے کون اے سپہ شام؟"
خود جوڑ کے ہاتھوں کو یہ بولا وہ خوش انجام | "سردار ہوں اس فوج کا میں حُر ہے مرا نام"
"دعوٰے غلامی ہے مجھے آلِ نبی سے"
"اب عفو ہو - محجوب ہوں اس بے ادبی سے"

"حاکم کا یہ جنگی ہے رسالہ مرے ہمراہ" | "نے داب سے واقف ہیں - نہ آداب سے آگاہ"

"بس غیظ نہ فرمایئے۔ بہرِ شہِ ذیجاہ" "اب بغیر اجازت نہ بڑھے گا کوئی واللہ!"
"ہے عفو و ترحم کا رواج آپ کے گھر سے"
"تقصیر بھی ہو جاتی ہے دنیا میں بشر سے"

جب حرؑ نے بصد عجز یہ تقریر سنائی — شہؑ بولے "مرے سر کی قسم جانے دو بھائی!"
اس وقت اجازت حرِؑ دیندار نے پائی — خود بھی بہ ادب آگے بڑھا۔ فوج بھی آئی
دیکھا جو شہنشاہؑ کے اقبال و حشم کو
مجرا کیا صف باندھ کے سلطانِ امم کو

یہ دیکھ کے فرمانے لگے شاہِؑ خوش اقبال — "کیا وجہ جو تم لوگ ہو سب مضطرب الحال؟"
تب عرض یہ کی حرؑ نے کہ "اے فاطمہؑ کے لال" — "بیتاب ہیں سب ماہیِ بے آب کی تمثال"
"آہوں کا دھواں اٹھتا ہے پیاسوں کے جگر سے"
"قطرہ نہیں پانی کا ملا تین پہر سے!"

دن گئے پانی کی تجسس میں ہوا خواہ" — "جز خاک نہ چشمہ کہیں دیکھا۔ نہ کہیں چاہ"
سو ہیں سوارانِ عراقی مرے ہمراہ" — "بے موت موئے جاتے ہیں سب یا شہِ ذیجاہ!"
اب جان نہ گھوڑوں میں۔ نہ سواروں میں دم ہے
اے ساقیِ کوثر کے پسر وقت کرم ہے!"

سنتے ہی بیتاب ہوئے سبطِ پیمبرؐ — دیکھا رخِ عباسؑ کو۔ اشک آنکھوں میں بھر کر
فرمایا کہ "یہ لوگ ہیں سب پیاس سے مضطر! — "جو ساتھ ہو پانی ابھی لے آؤ برادر!"
"بھیا! کمر اب کھولیو۔ پیاس ان کی بجھا کے"
"میں کانپ رہا ہوں کہ یہ بندے ہیں خدا کے!"

عباسؑ نے کی عرض کہ "ای کل کے مددگار" — کیا طاقت و قدرت جو کروں حکم میں تکرار"
"پر مصلحتاً عرض یہ کرتا ہے نمک خوار" — اطفال ہیں ساتھ آپ کے یا سیدِ ابرار!"

"مولا کہیں فرنخ ابھی جانا ہے یہاں سے"
مانگیں گے وہ پانی۔ تو پھر آئیگا کہاں سے"

فرمایا "مرے سر کی قسم کچھ نہ کہو اب" | "میری یہی مرضی ہے۔ کہ سیراب ہوں سب"
انسان کا انسان سے ہو رواں ہوتا ہی مطلب | مرجائیں مسلماں۔ یہ گوارا ہے مجھے کب"

میں مالکِ کوثر ہوں تردد تمہیں کیا ہے؟
"پیاس انکی بجھا دو۔ مرے بچوں کا خدا ہے!"

یہ سنتے ہی سقوں کو علمدار پکارے | "جو پانی ہے لے آؤ وہ سب۔ پاس ہمارے"
سقے جو تھے سرکار کے حاضر ہوئے سارے | مشکیزے بھی ہاتھوں سے بہ تعجیل اتارے

ہاتھوں میں کٹورے رفقائے شہ کے لئے تھے
سقوں نے پکھالوں کے دہن کھول دیئے تھے

مصروف ہوا خود پسر ساقیِ کوثر! | پیاسوں کو عطا ہونے لگے پانی کے ساغر
تقسیم ادھر کرتے تھے عباسؑ دلاور | پیاسوں کو ادھر دیتے تھے پانی علی اکبر

ہر لب پہ سخائے شہِ والا کا بیاں تھا
دریائے کرم ساقیِ کوثر کا رواں تھا!

چلاتے تھے سقے یہ۔ کٹوروں کو بجا کر | "جو فوج میں پیاسا ہو۔ وہ پانی پئے آ کر"
"یخ ہو گیا ہے آب۔ ہوا دشت کی کھا کر | "گرمی میں جگر سرد کرے۔ پیاس بجھا کر"

"یہ مشک ہر اک چشمۂ شیریں سے بھری ہے"
"کوثر کا جو مالک ہے سبیل اس نے دھری ہے!"

سب ہو چکی سیراب جو فوجِ حرِ دیندار | "عباسؑ سے فرمانے لگے سیدِ ابرار"
"مضطر ہیں زبانوں کو نکالے ہوئے رہوار!" | ہاں۔ انکو بھی سیراب کرو اے مرے غمخوار!"
"حیوانوں کا بھی قافلہ مغموم نہ رہجائے" | "یہ گھر ہے سخی کا۔ کوئی محروم نہ رہجائے"

سقّوں کو لئے ساتھ۔ بڑھے حضرتِ عباسؑ　　ہاتھوں میں لگن کوئی لئے تھا۔ تو کوئی تاس!

اسواروں کو جن گھوڑوں کی بجھنے کی نہ تھی آس　　جاں آگئی ان تازیوں میں جبکہ بجھی پیاس

جوانوں کا یہ پاس تھا جس شاہِ امم کو
پانی نہ ملا تین دن اُس بحرِ کرم کو!!

(انیس)

رباعیاتِ شہیر

(از جناب مولوی سید محمد نوح صاحب رئیس مچھلی شہر)

جس فرقہ میں جو ہے، اس کا یہ ہے مظنون ہشیار ہمیں ہیں، غیر سب ہیں مجنون
قرآن میں ہے شہیر! حق، حق کا یہ قول کُلُّ حزبٍ بما لدیہم فرحون

تعداد میں ہو حریف گو لاکھ زیاد چھوٹیں گے مگر نہ ہم خدا کا ارشاد
کم مِن فئۃٍ قلیلۃٍ کے آگے غلبت فئۃً کثیرۃً ہے ہمیں یاد

تا ہو نہ رجوعِ قلب سچے جی سے قربت ہوگی، نہ حق کی نزدیکی سے
دل اور طرف ہے رُخ ہے سوئے کعبہ کیا نفعِ نماز، اس اٹھا بیٹھی سے

ہر چند میں قائلِ ہمہ اوست نہیں لیکن کوئی شے بغیر از دوست نہیں
رگ رگ میں لہو، لہو میں گرمی اُس کی بے خون نہ گوشت، گوشت بے پوست نہیں

اسلام غریب ہے، غریب الوطن، آہ! ہے قوم کا حال ہند میں آ کے تباہ
طوفانِ حوادث ہے، تلاطم ہے عظیم بیڑے کا ہمارے ہے محافظ اللہ

خاموش ہوں کوئی مراد مساز نہیں وہ ساز ہوں میں کہ جس میں آواز نہیں
آواز بھی ہو تو کب ہے اندازِ کلام گویا ہوں مگر سخن کا انداز نہیں

ہر چند ضعیف و ہیچکارہ ہوں میں احباب کو اپنے پھر بھی پیارا ہوں میں
سننے کو ہے یہ نمودِ بے بود شہیر پیری میں بھی صبح کا ستارا ہوں میں